مدھوبنی ضلع اردو نامہ

(2025-26)

ناشر

ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی

ضلع اردو نامہ

مدھوبنی

(2025-26)

ناشر :

ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی

ضلع اردو نامہ مدھوبنی

سرپرست اعلیٰ	جناب ایس۔ایم۔ پرویز عالم، ڈائرکٹر اردو ڈائرکٹوریٹ پٹنہ بہار
ضلع سرپرست	جناب آنند شرما، ضلع مجسٹریٹ مدھوبنی
نگراں	جناب معراج احمد، انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی
ترتیب وتزئین	محمد مہتدیٰ ندوی، اردو مترجم کلکٹریٹ مدھوبنی
متن نویسی	امیر معاویہ قاسمی، معاون اردو مترجم کلکٹریٹ مدھوبنی
سال اشاعت	2025-26
تعداد اشاعت	۲۰۰ (دوسو عدد)
طباعت	ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی
ملنے کا پتہ	ضلع اردو زبان سیل، کلکٹریٹ مدھوبنی

(c) جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نوٹ: رسالہ میں شامل مشمولات قلم کاروں کے اپنے خیالات ہیں، ادارہ کا اتفاق ضروری نہیں ہے۔

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانات	قلم کار	صفحہ نمبر
۱۔	پیغام تہنیت	ڈائریکٹر اردو ڈائریکٹوریٹ، پٹنہ بہار	۵
۲۔	نیک خواہشات	ضلع مجسٹریٹ، مدھوبنی	۷
۳۔	پیغام	ایڈیشنل ضلع مجسٹریٹ، مدھوبنی	۸
۴۔	اظہار تشکر	انچارج افسر، ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی	۹
۵۔	شفیع الرحمن شفیع: فکر وفن کے آئینے میں	پروفیسر عبدالرافع	۱۰
۶۔	تحریکِ آزادی میں اردو صحافت کا رول	عزیر انجم	۳۰
۷۔	نولکھا راج محل	صدر عالم گوہر	۴۵
۸۔	مولانا ابوالکلام آزاد	ڈاکٹر عبدالغنی	۵۰
۹۔	بہار میں اردو زبان کا احیاء	امیر معاویہ قاسمی دربھنگوی	۵۶
۱۰۔	مدھوبنی میں اردو زبان وادب	شائق یکہتوی	۵۹
۱۱۔	فراق شناسی	تجمل حسین	۶۷
۱۲۔	مدھوبنی کا قلمی سفر	ڈاکٹر عمر فاروق قاسمی	۷۱
۱۳۔	مدھوبنی کی تہذیبی وراثت	وجہ القمر	۸۱
۱۴۔	برادران وطن اور اردو	محمد محسن ندوی سیتامڑھی	۸۳
۱۵۔	اردو ترجمہ نگاری	محمد اشرف رضا	۸۵
۱۶۔	عصر حاضر کی صحافت میں اخلاقیات کا فقدان	محمد انصار چندرسین پور مدھوبنی	۹۰
۱۷۔	کلیم عاجز بطور غزل گوشاعر	راہی قاسمی	۹۲
۱۸۔	مدھوبنی ضلع میں فروغ اردو: اقدامات اور امکانات	ڈاکٹر محمد حسین مصباحی	۹۴

۱۹۔ حاشیائی ادب	محمد مناظر حسین	۹۸
۲۰۔ غزل	احسان مکرم پوری	۱۰۲
۲۱۔ غزل	ڈاکٹر منور عالم راہی	۱۰۳
۲۲۔ غزل	محمد مجتبیٰ راحل قاسمی	۱۰۴
۲۳۔ غزل	شائق یکہتوی	۱۰۵
۲۴۔ غزل	زویا احترام تمنا	۱۰۶
۲۵۔ غزل	بھارتی رنجن کماری	۱۰۷
۲۶۔ غزل	ظفر امام حبیبی	۱۰۸
۲۷۔ غزل	مقصود عالم رفعت	۱۰۹
۲۸۔ غزل	سرور پنڈولوی	۱۱۰
۲۹۔ غزل	ارشد کمالی بالا ساتھوی	۱۱۱
۳۰۔ فروغِ اردو کے تعلق سے ضلع کی سرگرمیاں	محمد مہتدیٰ ندوی	۱۱۲
۳۱۔ ضلع کے اردو ملازمین	ادارہ	۱۱۴
۳۲۔ ضلعی پروگراموں کی تصویری جھلکیاں	ادارہ	۱۱۶

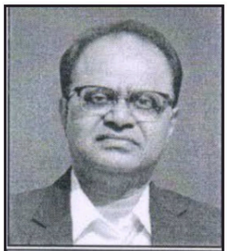

ایس.ایم. پرویز عالم

پیغام تہنیت

اردو زبان کی اہمیت وافادیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔اس زبان کی شیرینی اور چاشنی کا ہر طبقہ قائل ہے۔ یہ زبان انقلابی زبان ہے۔ یہ گنگا جمنی تہذیب وثقافت کی علمبردار ہے۔لوگوں کے درمیان محبت واخوت پیدا کرنے والی زبان ہے۔اردو نے ہندوستانی معاشرہ کو زینت بخشی ہے، اسے حسن عطا کیا ہے۔ایسی میٹھی مقبول عام زبان کا فروغ اوراس کی تشہیرواشاعت ہماری ذمہ داری ہے۔حکومت بہار دوسری سرکاری زبان اردو کی ترقی وتوسیع کے لئے پابند عہد ہے۔اس کے لئے حکومت نے ہر ممکن سہولتیں بھی مہیا کرائی ہیں۔

بہار میں اردو زبان و ادب کو ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ چار دہائیوں سے اردو کو ریاست بہار کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں کے اردوداں عوام کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ اردو میں اپنی درخواستیں ریاستی حکومت کے کسی بھی دفتر میں دے سکیں اور حسب ضرورت اردو میں ان کے جوابات بھی حاصل کر سکیں۔ اس کام کے لئے تقریباً تمام بلاک، سب ڈویژن اور کلکٹریٹ سطح پر اردو زبان سیل قائم ہے جہاں اردو ترجمہ آفیسر، سینئر اردو مترجم، اردو مترجم، نائب اردو مترجم، بالا درجہ محرر اور زیریں درجہ محرر بحال ہیں۔اردو ڈائرکٹوریٹ، حکومت بہار کے تحت ابھی حال ہی میں 851 معاون اردو مترجمین کی بحالی عمل میں آئی ہے، جن کی ماموری مذکورہ سبھی دفاتر سمیت سرکل آفس میں بھی ہوئی ہے۔مزید ہزاروں معاون اردو مترجمین کی بحالی کے لئے سرگرمی سے کارروائی جاری ہے۔ ان عملوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اردو میں موصول درخواستوں کا ہندی زبان میں ترجمہ کر کے متعلقہ افسر کے سامنے پیش کریں اور ضروری کارروائی کی اطلاع درخواست دہندگان کو اردو میں مہیا کرائیں۔اردو آبادی سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ اردو میں درخواست دینا اپنی عادت میں شامل کریں اور ہر سطح پر اردو میں درخواست دینے کا ماحول بنائیں۔ وہ اپنی زبان کی ترقی و ترویج کے لئے بیدار رہیں۔اپنی سطح سے عملی اقدام کریں اور اردو کو اپنے گھروں میں زندہ رکھیں۔اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دیں اور اردو اخبار، رسائل وجرائد خرید کر پڑھیں۔ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ اردو صرف جلسے جلوس کرنے سے زندہ نہیں رہے گی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اُسے اپنے روزمرّہ کی بول چال میں استعمال کریں۔اس سے اردو کی ماحول سازی بھی ہوگی اور اردو کی ترقی وترویج میں مدد بھی ملے گی۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے ذریعے اردو زبان کے فروغ وبقا اور نشر واشاعت کے لئے کئی مفید اور کامیاب منصوبے تسلسل کے ساتھ جاری ہیں۔ ضلعی سطح پر چلائے جا رہے منصوبوں کے تحت اردو داں طلبہ حوصلہ افزائی منصوبہ، اردو ملازمین کی صلاحیت سازی کے لئے اردو عمل گاہ، اردو زبان سے عوام وخواص کی دلچسپی بڑھانے اور اس کو باقی رکھنے کے لئے فروغ اردو سیمینار و مشاعرے کا انعقاد اور سبھی ضلع کلکٹریٹ میں واقع اردو زبان سیل کے ذریعہ ہر سال ”اردو نامہ“ کی اشاعت کی جاتی ہے جو اردو سے

لگاؤ اور دلچسپی پیدا کرنے میں مفید ثابت ہو رہا ہے۔ اردو زبان کے تئیں بیداری اور دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے سبھی اضلاع میں میٹرک، انٹر اور بی۔اے/ مساوی درجات کے اردو داں طلباء و طالبات کے درمیان تقریری مسابقے منعقد کرکے انہیں انعامی رقم کے ساتھ میمنٹو اور سرٹیفکیٹ دے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ریاستی سطح پر بھی اردو ڈائرکٹوریٹ کے ذریعے کئی کامیاب اور موثر اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ اس کے تحت ہر سال اردو زبان و ادب کے 22/ نامور شعراء و ادباء کی یومِ پیدائش/ یومِ وفات کے موقعے سے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرنے اور ان کی ادبی خدمات سے نئی نسل کو متعارف کرانے کی غرض سے یادگاری تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کی جانب سے ریاستی، ملکی و عالمی سطح پر اردو زبان و ادب کے فروغ و تشہیر اور اس کی آبیاری کے لئے سہ ماہی اردو مجلہ ''بھاشا سنگم'' کی اشاعت کی جاتی ہے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے اشاعتی امداد منصوبہ کے تحت قلم کاروں کو ان کی نگارشات کی طباعت کے لئے گرانٹ دی جاتی ہے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ نے بہار کی ۲۹/ عظیم شخصیات پر مونوگراف (فردنامہ) شائع کیا ہے جو اکابرین اردو ادب کی ادبی خدمات کو نئی نسل تک پہنچانے میں معاون ہے۔

عزت مآب ہر دل عزیز وزیر اعلیٰ نتیش کمار کی ایما پر اردو ڈائرکٹوریٹ نے اردو زبان کے فروغ کے لئے غیر اردو داں افسران، عملہ اور دیگر شعبۂ جات سے تعلق رکھنے والے خواہشمند لوگوں کو اردو زبان کی بنیادی جانکاری فراہم کرنے کے لئے آن لائن اردو لرننگ کورس کا نظم کیا ہے۔ آن لائن اردو لرننگ کورس سے نہ صرف ریاست بہار بلکہ ملک کی دیگر ریاستوں کے لوگ بھی بڑے شوق سے اردو پڑھنے لکھنے کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ اردو کی ترقی اور اس کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں یہ ایک موثر قدم ہے۔

ریاست بہار کے اردو داں عوام و خواص سے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اردو زبان کی نشر و اشاعت اور عوامی سطح پر اس کی بقا کی ذمہ داری آپ کے کندھوں پر ہے۔ اس لئے آپ کو اپنے حقوق و فرائض منصبی کے تعلق سے باخبر، حساس اور سرگرم عمل رہنا از حد ضروری ہے تا کہ اردو زبان اپنی خوبصورتی، دلکشی اور معنوی خوبیوں کے ساتھ آنے والی نسلوں تک پہنچ سکے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ اردو زبان کے تعلق سے عوام میں نسبتاً بیداری آئی ہے۔ بہر کیف **اردو زبان سیل، مدھوبنی کلکٹریٹ** کے ذریعہ اشاعت پذیر اس خوبصورت اور معلوماتی ''ضلع اردو نامہ'' کے لئے ضلع کے فعال ڈی ایم جناب **آنند شرما** (آئی۔اے۔ایس) اور انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل جناب **معراج احمد** قابلِ ستائش ہیں۔ ساتھ ہی **مدھوبنی ضلع** میں مامور تمام اردو عملے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اپنی منصبی ذمہ داریوں کو بخوبی ادا کرنے میں وہ اسی طرح کوشاں اور سرگرم عمل رہیں گے۔

(ایس۔ایم۔پرویز عالم)
ڈائریکٹر
اردو ڈائرکٹوریٹ

نیک خواہشات

اردو ڈائریکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومت بہار پٹنہ کے ماتحت ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی کی جانب سے گذشتہ سالوں کی طرح امسال بھی ضلع اردو نامہ کی اشاعت کی جارہی ہے؛ یہ رسالہ نہ صرف فروغ اردو اور اس کی ترویج و اشاعت میں مثالی کردار ادا کر رہا ہے بلکہ قلم کاروں، ادیبوں، شاعروں اور نو آموزوں کی تحریروں کو جلا بخشنے کا موقع دے رہا ہے۔

کسی بھی زبان میں رسائل و جرائد فروغ زبان و ادب کے علمبردار ہوتے ہیں، لسانی و ادبی تخلیق کے خالق اور قاری کے درمیان یہی رسائل و جرائد پل کا کام کرتے ہیں؛ ادیب و شاعر کی ذہن سوزی و عرق ریزی کے ذریعہ تخلیق کردہ شہ پاروں وفن پاروں کو قاری و عوام تک پہنچانا انہیں رسائل و جرائد کی مرہون منت ہے؛ تخلیقِ ادب وشعر کی جتنی اہمیت ہے متوازی خطوط پر رسائل و جرائد کی بھی اتنی ہی اہمیت مسلم الثبوت ہے کیونکہ شاعر و ادیب قاری کے لئے ہی شعر و ادب کی تخلیق کرتے ہیں؛ اس طرح سے دونوں ادب اور اس کے فروغ کے لئے تتمہ وتکملہ کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے فروغ ادب کے لئے تخلیق اور رسائل و جرائد میں باہمی ربط کا ہونا ناگزیر ہے۔

اس علمی و ادبی رسالہ کی اشاعت کے لئے میں ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی کے انچارج افسر جناب معراج احمد کو تہ دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ساتھ ہی مدھوبنی ضلع کے تمام اردو ملازمین بھی قابل ستائش ہیں کہ سبھی نے مل کر اس رسالہ کو شائع کرنے میں اپنا مثبت کردار ادا کیا۔

امید ہے کہ اردو کا یہ کارواں یونہی رواں دواں ہردم جواں رہے گا اور ہر سال ضلع اردو نامہ کی اشاعت ہوتی رہے گی۔

نیک خواہشات کے ساتھ
آنند شرما (آئی۔اے۔ایس)
ضلع مجسٹریٹ مدھوبنی

پیغام

اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومتِ بہار کے زیرِ سرپرستی "ضلع اردو نامہ مدھوبنی" کی اشاعت بلاشبہ اردو زبان و ادب کی ترویج میں ایک روشن سنگِ میل ہے؛ یہ رسالہ نہ صرف اہلِ قلم، شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کو منظرِ عام پر لانے کا ذریعہ ہے بلکہ نو آموز لکھنے والوں کو بھی اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا سنہری موقع فراہم کرتا ہے۔

ادبی رسائل ہمیشہ سے زبان و ادب کے فروغ کا مؤثر ذریعہ رہے ہیں، یہ تخلیق کار اور قاری کے درمیان ایک مضبوط کڑی کا کام انجام دیتے ہیں اور ادب کی فکری خوشبو کو عام افراد تک پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، ضلع اردو نامہ مدھوبنی بھی اسی روایت کا خوبصورت تسلسل ہے۔

ہم جناب معراج احمد انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل، مدھوبنی کو اس کامیاب اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور ان تمام اردو ملازمین و اہل قلم کو بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں جنہوں نے اس علمی کارواں کو جاری و ساری رکھنے میں حصہ لیا۔

نیک تمناؤں کے ساتھ

مکیش رنجن (بی۔اے۔ایس)

ایڈیشنل ڈسٹرکٹ کلکٹر، مدھوبنی

اظہار تشکر

مالی سال ۲۶-۲۰۲۵ کے لئے ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی کی جانب سے شائع شدہ "ضلع اردو نامہ" حاضر خدمت ہے۔ بحیثیت انچارج افسر میرے لئے نہایت خوشی کا موقع ہے کہ میرے زیر نگرانی یہ رسالہ شائع ہو رہا ہے، اس رسالہ میں شائع شدہ نظم ونثر دونوں طرح کے مواد ادبی حیثیت کے حامل ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ ماہرین فن کے ساتھ ساتھ نوخیز قلم کاروں ونورستہ شاعرو ادیب کو بھی جگہ ملے تاکہ شعراء، ادباء کی نئی نسل، نئی کھیپ تیار ہو سکے اور یہ علمی وادبی مجلہ سال در سال نئی فکر، نئی امنگ کے ساتھ مسلسل شائع ہوتا رہے۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر حکومت بہار کے معزز وزیر اعلیٰ عالی جناب نتیش کمار کا شکریہ ادا نہ کیا جائے کیونکہ وزیر اعلیٰ نے دیگر ترقیاتی کاموں کے ساتھ ساتھ اردو کے فروغ کے لئے بھی اردو ملازمین کی بحالی کو یقینی بنایا اور پہلے سے منظور شدہ معاون اردو مترجمین کی اسامی کو دوگنا کر کے فروغ اردو کے سلسلہ میں تاریخی کارنامہ انجام دیا، ساتھ ہی ضلع انتظامیہ مدھوبنی کے بھی بے حد ممنون ومشکور ہیں کہ ان کی بھرپور معاونت اور حمایت سے اردو کے تمام پروگرام بطریق احسن انجام پاتے ہیں اور تمام پروگراموں میں ڈی۔ایم صاحب اور دیگر افسران کی موجودگی سے اردو راست طور پر حکومت کی ترقیاتی اسکیموں میں شامل ہوتی ہے۔

ضلع اردو نامہ ۲۶-۲۰۲۵ کی بروقت اشاعت کے لئے مدھوبنی ضلع کے تمام اردو ملازمین بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے میری آواز پر لبیک کہتے ہوئے وقت مقررہ پر مواد کی حصولیابی کو یقینی بنا کر اپنا متحرک کردار ادا کیا اور یہ باور کرایا کہ وہ میری ہدایت کے مطابق کام کرنے کو ہمہ وقت تیار ہیں۔

دعاؤں کے ساتھ قوی امید ہے کہ جملہ اردو ملازمین اپنے فرائض منصبی کے تئیں اسی بیداری کا ثبوت آئندہ بھی پیش کرتے رہیں گے؛ ساتھ ہی تمام قلم کار، شاعر وادیب بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ قافلہ ادب کی ہمرکابی میں مسلسل آگے بڑھتے جاتے ہیں اور مسافران ادب میں سنہری حروف سے اپنا نام درج کراتے ہیں۔

دعاؤں کے ساتھ

معراج احمد

انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی

مولانا شفیع الرحمان شفیعؔ: فکروفن کے آئینے میں

(''آبشارِنوا'' کے خصوصی حوالے سے)

پروفیسر عبدالرافع
ملت کالج دربھنگہ

تیرا نغمہ ساحری، تیرا بیاں پیغمبری
تیرے قبضہ میں ہے اقلیم سخن کی داوری

...

شعر تیرے جگمگا اٹھتے ہیں اس ظلمات میں
جس طرح جگنو چمکتے ہیں بھری برسات میں

...

شمعِ تنہا کی طرح صبح کے تارے جیسے
شہر میں ایک ہی دو ہوں گے ہمارے جیسے

مختصر سوانح: نیپال کی ترائی سے متصل، جہالت کی تاریکی میں ڈوبی 'بسہا' نامی ایک بستی بابو برہی بلاک، مدھوبنی ضلع میں واقع ہے۔ یہ بستی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب وتمدن اور بھائی چارے کی نمایاں مثال پیش کرتی ہے۔ تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی، تمدنی، سماجی اور سیاسی اعتبار سے پچھڑے پن کی شکار ہے۔ یہاں کے باشندے اب رفتہ رفتہ ہر محاذ پر اپنا قدم جمانے کے لیے کوشاں ہیں اور بہت حد تک کامیاب بھی ہورہے ہیں۔ اس علاقے پر میتھلی زبان وکلچر کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ میتھلی اور اردو کے اشتراک سے تشکیل یافتہ کئی بولیاں مسلم آبادیوں میں روزمرہ کے طور پر مستعمل ہیں۔ اسی گاؤں میں ۹ر اگست ۱۹۵۲ء کو شفیع الرحمان شفیعؔ کی پیدائش ہوئی۔ شفیعؔ مرحوم خود رقم طراز ہیں:

> ریاست بہار کا وہ شمالی خطہ جو اپنی سرسبزی وشادابی کے سبب ہمیشہ پر بہار رہتا ہے، متھلانچل کے نام سے چمکتا اور دمکتا ہے۔ وہ نیپال کی سرحد سے بھی وابستہ ہے۔ یہاں میتھلی زبان، دہی چوڑے کی دکان، کسیلی، بیڑی، پان، کھیتوں میں گیہوں یا دھان، مکئی کی رکھوالی کے لیے مچان، تالابوں میں دوشیزاؤں اور ہر عمر کی صنف

نازک کا وقتِ فجر اشنان، مویشیوں کے لیے گھروں سے متصل یا باہر بتھان، بانس اور پھوس کے مکانوں کی اپنی انوکھی شان ہے۔ مندروں میں سنکھ کا ہیجان، مسجدوں میں اذان، دلوں میں قربت کے امکان کی پہچان ہیں۔ تیوہاروں، بازاروں اور سبزہ زاروں میں اشتراک، ہمہ آہنگوں میں ہم آہنگی، ہمہ رنگوں میں ہم رنگی کے سبب ایک دوسرے سے بے باک، لوگوں کے لیے دھان اور گیہوں کی بالیاں، فصلوں کی ہریالیاں، جھروکوں اور دروازوں پر جالیاں، کھانے پینے کے لیے گوناگوں قسموں کی تھالیاں، ندیوں کے نام پر برسات کی سیلابی نالیاں، آم کے پیڑوں کی ڈالیاں، مکئی یا دوسری فصلوں کے کھیتوں کی بیجان مجسموں کے ذریعہ رکھوالیاں، اکثر گھروں میں نہ تالے نہ تالیاں، بدلتے عالمی مناظر سے لاابالیاں اور طرح طرح کی بدحالیاں بھی بہ شکل خوش حالیاں موجود ہیں جہاں برسات کے موسم میں اکثر آفت اور کبھی کبھی سوغات لانے والے دو دریا، کملا بلان اور بھتی بلان لوگوں کو محصور کرنے کے باوجود ہر سال انھیں مقہور و مجبور بناتے آرہے ہیں، جس میں جغرافیائی تغیرات کی حیرت، معاشرتی تبدلات کی بوالعجبیت، انسیت اور اقدار میں گرم جوشی کی جگہ برودت، سہولتوں کی کثرت میں یگانگت کی قلت اور روحانی عظمت وعزت کی جگہ نفسانی قعرِ مذلت کی طرف زوال کی راہ لے جانے والی شدت بھی ہے۔'' (یکہتہ اور اطراف: منور سلطان ندوی: ایک ممتاز ہستی کی کہانی، یادوں کی زبانی؛ ۲۰۱۲ء؛ ص ۲۴۷-۲۴۶)

کسے خبر تھی کہ ایسے قصبہ سے تعلق رکھنے والے' گدری کا لعل، محمد شفیع الرحمن شفیع تعلیم و تعلم، درس و تدریس، اور شعر و ادب کی دنیا میں صبح کا تارا اور بستی کا دلارا بنیں گے۔

مولانا شفیع مرحوم بچپن سے ہی ذہین و فطین تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنی بستی میں حاصل کی۔ اعلی ابتدائی تعلیم کچھ دوری پر واقع بازار نرہیا کے مدرسہ نصرۃ الاسلام میں اور ثانوی اپنے علاقے کی مردم خیز بستی یکہتہ میں مکمل کی۔ وہاں ان کا دل خوب لگا اور لگے بھی کیوں نہیں! وہاں وہ اپنی ذہانت اور خوش زبانی کی وجہ سے پورے قصبہ کے راج دلارے بنے رہے لیکن انھیں 'اگنی کی اڑان' بھرنا تھی۔ نئے سرے سے توشۂ سفر کا انتظام و انصرام کر کے سرزمین عظیم آباد کو اپنا مستقل مستقر بنا لیا۔

بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ پٹنہ سے عالم و فاضل (گولڈ میڈلسٹ) اور پٹنہ یونیورسٹی سے انگریزی و فارسی میں ایم۔ اے ہیں۔ اسی یونیورسٹی سے بی۔ ایڈ بھی مکمل کیا۔

انھوں نے ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ میں حکومت ہند کے محکمۂ ثقافت سے منظور شدہ وظیفہ پر 'بہار میں فارسی مثنوی نگاری' کے عنوان پر تحقیقی مقالہ کا کام شروع کیا، مگر تکمیل سے پہلے ملازمت میں چلے آئے اور وہ کام یوں ہی نامکمل رہ گیا۔

مولانا مرحوم کی پہلی ملازمت خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے بطور کسٹوڈین (انچارج پبلیکیشن) شروع ہوئی، جو تقریباً پانچ سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۸۱ء میں بطور انگریزی استاد ریاست بہار کے سب سے قدیم اقلیتی تعلیمی ادارہ، محمڈن اینگلو عربک اسکول تشریف لے آئے، جہاں سے ۳۱/ اگست ۲۰۱۲ء میں سبک دوشی ہوئی۔

شفیع مرحوم آل بہار مدرسہ اسٹوڈنٹس یونین کے بانی رکن، معتمد اعلیٰ وصدر کے عہدے پر ۱۹۶۹ تا ۱۹۸۲ فائز رہے۔ بہار مدرسہ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن رجسٹرڈ کے بانی ومعتمد اعلیٰ ۱۹۷۸ تا ۱۹۸۵ء رہے اور اپنی ذمہ داری بہ حسن وخوبی نبھاتے رہے۔ مجلس ادب، ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی کے معتمد اور ادبی مجلہ کے مدیر (۷۳۔ ۱۹۷۲ء)، بزم پرویز شاہدی، بزم ثاقب، ادبی مرکز اور دیگر انجمنوں کے مشاعروں میں شرکت، حلقۂ ادب، انجمن ترقی اردو کے سکریٹری، سلسلۂ خانقاہ منعمیہ، پٹنہ سیٹی کے بانی معتمد اعلیٰ (۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۸ء) مجلس عاملہ، بیت المال کمیٹی، کنکڑ باغ، پٹنہ، الخیر چیریٹیبل سوسائٹی اور بہار رابطہ کمیٹی کے رکن، طلبہ کو سرکاری وظائف کے سلسلے میں تعاون ورہنمائی کے لیے ایک لمبی مدت تک پوری ریاست میں مقبول رہے۔

تنظیمی سرگرمیوں میں نادار بچوں کی تعلیمی کفالت، مفت تعلیم کے لیے مکاتب کا قیام، ہائی اسکولوں میں خاص کر طالبات اور بہت ہی محتاج طلبہ کے لیے فیس کی رقم اور کتابوں کی فراہمی، جاڑے میں کمبل، عید کے موقع پر کپڑے، غریب لڑکیوں کی شادی میں تعاون اور تکنیکی و پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں میں نادار طلبہ کے لیے فیس کی رقم کا نظم وغیرہ میں ان کی دلچسپی ہمیشہ رہی۔ اپنے پاس تو اتنی رقم کا ہونا تصور سے بھی باہر تھا۔ اس کے لیے دردر جانا اور موٹی موٹی رقم لوگوں سے حاصل کرنے کی ذلت کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھنا ان کے شعار کا روشن پہلو رہا۔

شفیع مرحوم نے تصنیفات وتالیفات میں بھی اہم کردار نبھایا۔ توضیحی فہرست مخطوطات عربی وفارسی خدابخش لائبریری، پٹنہ، جلد ۳۴ کے معاون مرتب، شہری زندگی برائے درجہ نہم ودہم، بہار ٹیکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن، پٹنہ کے مترجم۔ بھارتی بھون سے شائع گولڈن اگزامنیشن گائیڈ: اردو وفارسی کے مؤلف (۱۹۸۵ء تا ۲۰۰۱ء)، گولڈن کی ٹو اردو۔ فارسی درسی کتب (۱۹۸۶ تا ۲۰۰۱)۔ How to Translate into English (Anglo Urdu)، بہار ایجوکیشن پروجیکٹ سے شائع: پہلا زینہ اردو، پہلا زینہ حساب، شعور تدریس، پیش کش اور ہفتہ وار جائزہ نامہ۔ مجلہ جشن صد سالہ محمڈن اینگلو عربک اسکول کے معاون مدیر۔ اسکول میگزین کے کئی شماروں کے مدیر اعلیٰ، سلسلہ کے سالانہ مشاعرۂ حمد ونعت کے گلدستہ 'سلسلہ نامہ' کے کئی شماروں کے مرتب، عالمی علمی مجلہ 'سہ ماہی انوار مخدوم'، بہار شریف کے بانی مدیر (شمارہ اول تا ہشتم)۔ قانون آر۔ ٹی۔ ای کا اردو ترجمہ۔ اکثر مضامین جرائد و اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ترجمان اسمبلی، پٹنہ میں بھی دو مضامین شائع ہوئے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ سے 'روشنی' اور 'باتیں جن سے زندگی سنورتی ہے' کے عنوان سے کئی مقالے شائع ہوئے۔ ایک بار پٹنہ دوردرشن سے ایک نعت شریف بھی ٹیلی کاسٹ ہوئی۔

مولانا شفیع مرحوم خود اپنی شاعری کے آغاز کے متعلق رقمطراز ہیں:

> ''پانچویں، چھٹی جماعت میں ایک گہرے دوست کو اپنی اس وقت کی اردو میں اس وقت کے معیار کے مطابق اشعار میں خط لکھنے کا شوق پیدا ہوا اور وہاں سے جو جراثیم دماغ میں داخل ہوئے وہ بار بار کی جراثیم کش تدبیروں کے باوجود ختم نہیں ہوئے۔ اس کے بعد نویں۔ دسویں جماعت میں باضابطہ سہروں، تہنیتوں اور استقبالیہ نظموں کے ساتھ غزل کا سلسلہ شروع ہوا۔ عید اور بقرعید کے مواقع پر دیہاتی مشاعروں میں پابندی سے شرکت ہونے لگی۔''

مولانا شفیعؔ مرحوم بہار مدرسہ اگزامینیشن بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کر کے عالم میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں کے وسیع میدان اور سازگار ماحول سے اپنی لیاقت کو جلا بخشنے میں تقویت ملی۔ سب سے پہلا مشاعرہ حضرت عطاء الرحمان عطاؔ کاکوی کی صدارت میں پڑھنے کا موقع ملا۔ وہاں سے حوصلہ ملا اور یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ کسی استاد سے شرف تلمذ حاصل نہ کر سکے لیکن اساتذہ اور کہنہ مشق شعرا کی محفل میں شرکت کرنے کا مبارک موقع بار بار آیا۔ بزم پرویز شاہدی کا مشاعرہ رمزؔ عظیم آبادی کی صدارت میں اور بزم ثاقب کا مشاعرہ حضرت عطاؔ کاکوی کی صدارت میں منعقد ہوتا تھا جن میں پابندی سے شرکت ہونے لگی۔ حلقۂ ادب کے مشاعروں میں پروفیسر عبدالمغنی کی صدارت میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ بعدہ کئی مشاعرے حضرت کلیم عاجزؔ، ناوکؔ حمزہ پوری اور سلطان اخترؔ کی صدارتوں میں پڑھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ سلسلہ کے زیر اہتمام میتن گھاٹ کے سالانہ مشاعرۂ حمد و نعت کا خود اہتمام کیا کرتے تھے۔ اسی طرح دیگر انجمنوں، محفلوں اور مشاعروں میں گاہے بہ گاہے شرکت ہونے لگی۔ وہ رفتہ رفتہ دبستانِ عظیم آباد کے اعلیٰ وصالح شعری وادبی روایات کے امین بن گئے۔ پھر مشاعروں میں شرکت بھی بند کر دی۔ صحت اور ماحول سازگار نہ ہونے کے سبب اواخرِ عمر کے چند سال اپنے دولت خانہ میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ 27 مارچ 2022 کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

منظوم مفہوم القرآن مولانا شفیع الرحمن شفیعؔ کی متفکرانہ ومتصوفانہ شخصیت، ایک عہد ساز، کہنہ مشق، استاذ الاساتذہ اور بطل جلیل کا نگارخانہ ہے۔ ان کے اعمال وافعال، تفکرات وتخیلات، سیرت وکردار، اخلاق وعادات وخصائل سراپا دینی منہج پر منتج ہیں۔ دنیاوی لذتوں اور آرام وآسائش سے بالاتر ہو کر، اپنے مقدس گوشۂ خانہ میں براجمان ہو کر احکام الٰہی، سنت نبوی ﷺ اور منظوم مفہوم القرآن کو خواص وعوام کے قلوب واذہان میں جاں گزیں کرنے میں اپنی زندگی کے قیمتی شب وروز کو وقف کر دیا تھا۔

شفیعؔ کا یہ سب سے اہم اور عہد ساز کارنامہ ہے۔ وہ اس کائنات کی مقدس ترین کتاب، قرآن کریم کی سورتوں کے منظوم مفہوم میں جس للّٰہیت، نیک نیتی، نیک نفسی، عرق ریزی، جانفشانی، ایمانداری، علمی بصیرت، تخلیقی ہنرمندی اور ذہنی اختراع کے ساتھ انجام دیا ہے وہ عام قاری کے لیے بھی ادب کے علاوہ ہدایت کی مشعل ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا اجر انھیں ضرور عطا کرے گا۔

مولانا شفیعؔ سورۃ البقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۂ یاسین، سورۃ الرحمن اور اٹھائیسویں سے تیسویں پارہ تک مفہوم القرآن کا کام مکمل کر لیا تھا۔ اس کی اشاعت بہت جلد ہو گی۔

شفیعؔ مرحوم کی ادبی خدمات بھی ناقابلِ فراموش اور باعثِ فخر وامتیاز ہیں۔ انجمن، محفل اور مشاعرہ سے کنارہ کش ہو کر وہ گوشہ نشینی کو اپنا شیوۂ حیات بنائے ہوئے تھے۔ انھوں نے انسانی تعریف وتوصیف، داد وتحسین، انعام واکرام اور صلے کی پرواہ کیے بغیر اردو شعر وادب کے سرمایے میں اپنے جواہر پاروں اور صدف ریزوں سے روز افزوں اضافے کیے ہیں۔

منظوم مفہوم القرآن کے علاوہ ان کی شعری نگارشات حمد، نعت، غزل، نظم، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مستزاد اور دوہوں پر محیط ہیں۔ فارسی وانگریزی شاہکاروں کے تراجم بھی بڑے دل کش ہیں۔ وہ بیک وقت پانچ زبانوں عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور ہندی پر یکساں قدرتِ رکھتے تھے، جس کی درخشندہ مثال پانچ زبانوں پر مشتمل ان کے حمدیہ ونعتیہ کلام اور چند غزلیں ہیں۔ انھوں نے فارسی

کے معروف اور آفاقی شعرا مثلاً مولانا رومی، حافظؔ شیرازی، شیخ سعدیؔ اور امیر خسروؔ و بیدلؔ، نظامی گنجویؔ کے علاوہ مختلف شعرا کی فارسی تخلیقات کو اردو میں شعری پیراہن عطا کیا ہے۔ انگریزی شعراء بالخصوص شیکسپئر کے سانیٹ، الیگزینڈر پوپ، جان ڈرائیڈن، جان ڈن، لانگ فیلو، ربندر ناتھ ٹیگور اور دیگر شعراء کی تخلیقات کو اردو میں منظوم ادب پاروں کی شکل میں چمکا دیا ہے، جن سے ان کی علمی بصیرت، فنکارانہ ہنرمندی اور مذکورہ زبانوں پر گہری گرفت کا بخوبی علم ہوتا ہے۔

غزلوں، نظموں، قطعات اور رباعیات کی ہیئت میں پیش کردہ ان کا کارنامہ بھی منارۂ نور کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے مطالعے سے قارئین کا مسحور و مسکور ہو جانا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔

مولانا شفیعؔ مرحوم کی غزلیں کلاسیکی شعری روایت کی امین اور جدید شعری روایت کی پاسدار ہیں اور ان دونوں کا حسین امتزاج ان کی انفرادی تشخص کا استعارہ ہے۔ انھوں نے قومی و بین الاقوامی عصری مسائل کے تقریباً تمام پہلوؤں کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی عقائد، قرآنیات، سنت، روایت، ثقافت، تاریخ، سیاست، جغرافیہ، عمرانیات، ماحولیات، نفسیات، عام معلومات اور نظامِ کائنات میں موجود اللہ تعالیٰ کی آیات وغیرہ پر غزلیں، نظمیں، قطعات اور رباعیات تخلیق کر کے اپنی علمی بصیرت، تخلیقی اختراع اور فنکارانہ ہنرمندی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ علاوہ ازیں 'معجزاتی جھلکیاں' کے عنوان سے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کو نظم کا پیراہن عطا کیا ہے۔ یہ علمی کارنامہ سیرت کے ایک رخ کو صحاح ستہ کی روشنی میں واضح کرتا ہے۔ وہ اپنی غزلیات سے متعلق لکھتے ہیں:۔

حرف سے حرف مل کر بنا لفظ جب، لفظ سے لفظ مل کر ندا بن گیا
وزنِ آواز نے شعر کی شکل دی، شعر سے شعر مل کر نوا بن گیا

•••

ہے شفیعؔ دل کی مری زباں، مرا صاف صاف ہے ہر بیاں
نہ تضادِ فکر کا قول سے، نہ عمل پہ کوئی حجاب ہے

•••

گلاب الفاظ ہو جائیں تو خوشبو ہو معانی میں
معطر بزمِ یاراں ہر طرف ہو زندگانی میں

•••

خوشبو ہے لفظ لفظ میں میرے بسی شفیعؔ
اشعار پھول ہیں دل کے دیار کے

•••

بوئے گل، مشکِ ختن، لعلِ بدخشاں ہوں گے
میرے اشعار سے آباد گلستاں ہوں گے

•••

جو دل میں آگیا وہی کہتا گیا شفیع
چولھے میں جائیں آپ کے مفعول فاعلات

•••

اپنے بارے میں کہتے ہیں:

انجمن ، بزم ، دائرہ ہوں میں
مہر و الفت کا سلسلہ ہوں میں

•••

دامن پہ مرے داغ نہیں چھینٹے ہیں خوں کے
بسمل تھے کئی مرغِ سحر صحنِ چمن میں

•••

پرواز تیری عرش بریں تک ہے جب شفیع
کیوں زندگی کو دیکھ رہا ہے حباب میں

•••

میں گل شعار، گل نواز، گل نگار ہوں
گل چیں ہو، گل عذار ہو، تم گل فروش ہو

•••

ہم دشتِ تصور میں بھٹکنے نہیں جاتے
تصدیق شدہ صبح کی ہوتی ہے صبا اور

•••

شفیع الرحمان شفیع نے قوافی، ردیف، رعایات، تلازمات، تراکیب، تشبیہات، استعارات، بحور و اوزان اور صنعتوں کے استعمال میں تخلیقی جدت کی نمایاں مثالیں قائم کی ہیں۔
شفیع کے تقریباً دس مجموعے اشاعت کے مرحلے میں ہیں۔ یہ مجموعے عنقریب قارئین، مداحین اور احباب کی دسترس میں ہوں

گے۔غزلوں پر مشتمل ان کا پہلا مجموعہ ’آبشارِنوا‘ شائع ہوکر مقبولِ خاص و عام ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ دو اور مجموعے بنام،’’جوئبارِنوا اور کوہسارِنوا‘‘ زیرِ ترتیب ہیں۔تقریباً چھ پاروں پر مشتمل منظوم ’مفہوم القرآن‘ بھی اشاعت کے مرحلے میں ہے۔منظومات میں ایک حمد، ایک نعت اور ایک عام منظومات کے مجموعے بھی ترتیب کے مراحل میں ہیں۔قطعات اور رباعیات کے دو جداگانہ مجموعے مواد کے اعتبار سے مکمل ہیں۔معجزاتی جھلکیاں اور قرآنی واقعات کے نام سے دو الگ الگ مجموعے بھی آئیں گے۔

شفیع الرحمان شفیعؔ کے کلام کی قرأت و تفہیم کے لیے عربی، فارسی اور اردو کلاسیکی شعر و ادب کے مطالعے کے ساتھ ساتھ قرآن و احادیث، سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، سیرۃ الصحابہ، سماجیات، عمرانیات، تاریخ، تہذیب، معجزات و کرامات، اور تاریخی واقعات کا مطالعہ اور اس کا فہم و درک ناگزیر ہے۔

عاجزی و انکساری اور بے نیازی کا دبیز لبادہ زیبِ تن کیے چمنِ شعر و ادب کا یہ ’دیدہ ور‘ شاعر کبھی دنیا کی سب سے مقدس ترین الہامی کتاب ’قرآن شریف‘ کے منظوم مفہوم میں غوطہ زن رہے ہیں تو کبھی صحاحِ ستہ کی احادیثِ کریمہ کے منظوم تراجم میں مستغرق۔ کبھی قطعات میں ایمان و ایقان، عقیدت و محبت، اخلاق و اخلاص اور عصرِ حاضر کے گوناگوں مسائل کی عکاسی کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے تو کبھی رباعی جیسی سخت جاں صنف میں مختلف بحور و اوزان کے ساتھ عصرِ حاضر کے مسائل و موضوعات کی پیش کش میں اپنی خلاقانہ بصیرت اور علمی استعداد کے جلوے بکھیر رہے تھے۔کبھی انگریزی شعر و ادب کے شہرۂ آفاق شعرا کے کلام کا منظوم تراجم پیش کر کے اردو شعر و ادب کے خزانے کو مالا مال کرنے میں منہمک تھے تو کبھی قطعات کے ذریعے لوگوں کو تازہ دم کر رہے تھے۔ حسبِ ذوق دوہے بھی ان کے قلم سے سنورتے رہے ہیں۔

شفیعؔ مرحوم معاصر ایوانِ شعر و ادب میں ایک مست ہاتھی کی طرح داخل ہوئے تھے اور سابقہ تمام آہنی دیواروں کو مسمار کر کے ایک نیا تاج محل تعمیر کر کے دنیا سے رخصت ہوئے، جس کے باغوں کے صد ہزار رنگ اور خوشبوؤں سے سات سمندر پار کے قارئین و مداحین بھی معطر ہو رہے ہیں۔انھوں نے اپنے تاج محل کے گلزارِ ارم میں ایسے ایسے پھول سجائے ہیں کہ جن کا انتخاب ناممکن ہے۔ ہر پھول اردو شعر و ادب کے لیے دل کش، شاداب اور مسرت بخش ہے۔ان کی غزلیں کلاسیکی شاعری کی آبرو اور معاصر شعرا کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

’آبشارِنوا‘ ان کا پہلا مجموعہ ہے جو یقیناً نقشِ ثانی کا اعلانیہ ہے۔اس نقشِ اول سے بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں حرکت و حرارت اور سرگرمِ عمل رہنے کی مقناطیسی قوت حد درجہ موجود ہے جو شفیعؔ مرحوم کے انفرادو امتیاز کا درخشندہ باب ہے۔

مشرقی علوم و ادبیات کی روایت سے ان کا گہرا اور منضبط و مربوط رشتہ ہے اور ان کے منہاج و مبادیات اور ان کی اساس پر گہری گرفت بھی۔ان علوم سے وابستگی و ہم رشتگی نے ان کے افکار و تجربات کو جلا بخشی ہے جس کی درخشندہ مثال ان کی یہ تخلیقات ہیں۔

ان کی شاعری کیا ہے؟ سراپا خدائی ودیعت ہے۔یہ خدائی تحفہ ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

شفیع الرحمان شفیعؔ قادر الکلام، کہنہ مشق اور صاحب طرز شاعر ہیں۔ زود گوئی ان کی صفات عالیہ میں سے ایک ہے۔ ایک پھول کے مضمون کو سو رنگ وڈھنگ سے باندھنے پر قادر ہیں۔ تقریباً پانچ دہائیوں تک غزل کی آبیاری و آبپاشی اپنے خون جگر سے کرتے رہے ہیں۔ ان کی غزلوں کے مطالعے سے ان کی علمی بصیرت، وسعت فکر، وسیع النظری، کشادہ ذہنی اور کثیر المطالعہ ہونے کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں آمد، تموج وطغیانی، جوش وخروش اور آبشار نوا سے مملو ہیں۔

شفیعؔ مرحوم نے اپنی تخلیقات کی اساس امر بالمعروف، نہی عن المنکر، متصوفانہ افکار وخیالات اور فکر وتعمیر پر رکھی ہے۔ وہ انسانی فطرت کے رمز شناس ہیں۔ انسانی زندگی میں ہونے والے مختلف واقعات، نت نئے مسائل: سیاسی، سماجی، تہذیبی اور انسانی اقدار پر گہری نظر ہے۔ آج ہمارا معاشرہ جس کربناک صورتحال، بے راہ روی، بداعمالی، ذہنی ناآسودگی، تباہی وبربادی، عیاری ومکاری، اخلاقی قدروں کی پامالی، مذہب بیزاری، انسانیت سوز حرکتیں، ذاتی بغض وعناد، اقرباپروری، غیبت وچغل خوری کا شکار ہے، ان تمام خامیوں کو بڑی شائستگی، برجستگی، شستگی، سنجیدگی ومتانت کے ساتھ پیش کرتے رہے ہیں۔

شفیعؔ کی شعری وعلمی لیاقت اور فنی استعداد کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے معروف کلاسیکی ونیم کلاسیکی، اور معاصر شعرا مثلاً ولیؔ، میرؔ، سوداؔ، مومنؔ، غالبؔ، ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، داغؔ، مصحفیؔ، آتشؔ، جرأتؔ، رنگینؔ، نظیرؔ اکبرآبادی، شادؔ عظیم آبادی، بسملؔ عظیم آبادی، جمیلؔ مظہری، اکبرؔ، جگرؔ، اقبالؔ، فیضؔ، کلیم عاجزؔ وغیرہ کے علاوہ مختلف شعرا کی زمین میں یا ان کی ردیف میں غزلیں تخلیق کی ہیں۔ لیکن کہیں بھی ان کے بنیادی آہنگ، موسیقیت، ترنم میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا ہے۔ اس ضمن میں ان کا امتیاز وانفرادیہ ہے کہ ان غزلوں میں خود اختراعی قوافی کو جس خوبصورتی سے خلق کر کے سجایا اور سنوارا ہے، اس سے التباس ہوتا ہے کہ آیا یہ مذکورہ شعرا کی غزلیں ہیں یا شفیعؔ کی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے مذکورہ شعرا کی کہی ہوئی غزلوں کے اشعار کی تعداد میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ انھوں نے تقریباً بیس، پچیس اور تیس اشعار پر مشتمل غزلیں تخلیق کی ہیں۔ ان کے قوافی ان کی قادر الکلامی کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مجموعہ 'آبشار نوا' کا ایک اختصاص ان کی 'ردیفیں' ہیں۔ انھوں نے ردیف کو جس فنکارانہ ہنرمندی سے خلق کیا اس سے ان کی ردیف کے رمز وایما سے گہری واقفیت، علمی لیاقت اور قدرت کاملہ کا علم ہوتا ہے۔ ان ردیفوں کی پیش کش، برتنے کا انداز اتنا شاندار اور جاندار ہے کہ ان کی جدت طرازی پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ذیل میں بطور مثال چند ردیفیں دی جاتی ہیں جن سے میری تحریر کی تصدیق وتائید آسانی سے ہوگی:

''اسے بھول جا، بسمل کی طرح تو یوں نہ تڑپ، گپ شپ، حضرت، کا ہاتھ، کے وارث، آج، ہیچ نہیں سمجھ، نہ پوچھ، کے باوجود، لیتا ہے خود، میں ڈھونڈ، ہے العیاذ، کبھی ادھر کبھی ادھر، ژاژ، خالص، خلوص، کا مرض، خدا حافظ، حیف، میں اب تک، بھائی جاں، بھی نہ سکوں، ہے اور میں ہوں، سے لگ جاتے ہیں، کے نگہباں کہاں سو رہے ہیں، جا مجھ کو، انشاء اللہ، اور زیادہ، استغفر اللہ، شکریہ، دوستی، جناب، جناب عالی، ہے بھائی، بھائی جان، صاحب، اک

تازہ غزل کہ دی، کیوں نہیں دیتے، خدا خیر کرے، غزل پیارے، گئے ہوں گے، نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے، رہے رہے نہ رہے، ہے کیا کہیے‘‘۔

یہ تو چند مثالیں ہیں۔ اس طرح کی معانی خیز اور خوبصورت ردیفیں بھری پڑی ہیں۔ مذکورہ بالا ردیفوں میں مختصر، طویل اور طویل ترین ردیفوں نے غزلوں میں مقصدیت، معنویت، انفرادیت، تخلیقیت، موسیقیت، جدت، ندرت اور مانوسیت کا حسین امتزاج پیدا کر کے وقار و اعتبار عطا کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

نہ شعورِ زباں، نہ مزاجِ غزل، وہ وقارِ سخن کا ذرا نہ رہا
نہ وہ سوزِ جگر، نہ وہ ساز رہا، وہ زمیں نہ رہی، وہ سما نہ رہا

•••

ہے اسی میں حسن، جسے بقا، ہے جسے فنا، اسے بھول جا
اسی ذوالجلال سے لو لگا، جو ہو بے وفا، اسے بھول جا

•••

دنیا ہمارے واسطے زنداں ہے، العیاذ!
چاروں طرف سے یورشِ شیطاں ہے، العیاذ!

•••

ہے کس تلاش میں نظر، کبھی اِدھر کبھی اُدھر
ہے جستجو عجیب تر، کبھی اِدھر، کبھی اُدھر

•••

لگا تا آگ پانی میں یہ جادوگر، معاذ اللہ!
یہ واعظ شہر کو کر دے گا خاکستر، معاذ اللہ!

•••

یہ پل پل خرافات، استغفر اللہ!
کرو کام کی بات، استغفر اللہ!

•••

ہوگی، ہوگی، ہوگی بارش، انشاء اللہ!
پوری ہوگی دل کی خواہش، انشاء اللہ!

•••

اے مرے، ہم سفر، ہم زباں، شکریہ!
زادِ رہ پہلے، پھر لے جاں، شکریہ!

...

بہار کل بھی اے ہمدم رہے، رہے، نہ رہے
نفس نفس کا یہ سرگم رہے، رہے، نہ رہے

...

اسی طرح ان کی خلاقانہ بصیرت اور فنی محاسن اس مجموعہ کے قوافی کی تخلیق میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اگر ان کے تخلیق شدہ قوافی کو یکجا کیے جائیں تو ایک لغت تیار ہوسکتا ہے۔ انھوں نے ردیفوں کی مناسبت، موافقت اور مطابقت سے قوافی کی تخلیق میں اپنا خون جگر شامل کیا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ مجموعہ معاصر شعرا کے لیے 'ستارۂ صبح' بن گیا ہے۔ ان قوافی پر نظر ڈالنے سے لگتا ہے کہ ان کے پاس الفاظ کے ذخائر ہیں اور خود بخود قرطاس ابیض کی زینت بنتے جارہے ہیں۔ چند قوافی دیکھے جائیں:

''آستیں، مہ جبیں، خشمگیں، منحر، مقدر، گراں، سائباں، اجابت، کسالت، خجالت،، چوپٹ، کھٹکا، لٹکا، سالار، مطاع، انتفاع، ضیاع، استماع، صداع، قینقاع، مسئلہ، مرحلہ، غلغلہ، مختوم، لامعلوم، خرطوم، بھبھوکا، کسو، تھرتھری، بھرتری، خودسری، اشکاب، آتشاب، لفظاب، قطراب، سرخاب، دریاب، اَطناب اِطناب، اعراب، جلباب، مآب، مرگاب، علی الصباح، علی الفلاح، مباح،، وضیح، مدیح، ذبیح، صریح، شاخ، فراخ، چٹاخ، کاخ، تنسیخ، توبیخ، ساعد، سواد، محاذ، عیاذ، آڑ، بگاڑ، اجاڑ، سپاس، مماس، خراش، آش، مہوش، ممکنات، مسابقات، مقراض، اعراض، اغماض، اسقاط، قیراط، مربوط، منقوط، مصرع، منبع، پلوع، جزوع، رکوع، منوع، سماع، مطاع، اصناف، مطاف، ایلاف، اکناف، عاق، شاق، گشت، طشت، ننگ، ملنگ، لایزال، ذوالجلال، غزل، اٹکل، چھاگل، نستعین، کمین، فان، عصیان، قرآں، نسیان، ہیجان، من وعن، نہاں نہاں، گماں گماں، جہاں جہاں، رواں دواں، نزاکتیں، کراہتیں، التہاب، شتاب، شہاب، غراب، مخدرات، الٰہیات، مباہلات، لن ترانی، عسقلانی، حرا، بکا، ہمم، زہراب، کمخاب، فتناب، چناں، جناں، مضیٰ، بلیٰ، مغضوب، مجذوب، نیوش، بگوش، مَحال، مُحال، مہال، مَنال، مُنال، اتصال، خاکستر، ہیہات، مجادلہ، خسروانہ، مراسلہ، بیعانہ، بہیمانہ، دزدیدہ، بخشیدہ، تائید، تہدید، بعید، لیزر، میزر، شجر شجر، جدھر جدھر، ڈگر ڈگر، اغل بغل، عجاب، غراب، ممولا، ٹٹولا، خراج، اختلاج، اسفناج، عاجلہ، ضابطہ، فگار، معاد، عناد، مسعود، بہبود، قلادہ، شہادہ، نقاط، صراط، وضیع، وقیع، لولاک، شنید، نعید، اول جلول'' وغیرہ۔

مثال کے لیے کچھ اشعار ذیل میں دیے جارہے ہیں:

ابتدا کب ہوئی، انتہا ہوگی کب، درمیاں ہے اگر تو کدھر بیشتر
کون بتلائے گا، کس کو اس کی خبر، ایک مبہم گماں، زندگی مختصر

...

اے غمِ زندگی، تلخ تر ذائقہ، رفتہ رفتہ ہوا تو نشاط آفریں
ہم نوا، ہم نفس، ہم ندا، ہم صدا، دلبر و دلربا، دلکش و دلنشیں

•••

ہوئے گلستان دشت و صحرا گذر گئے وہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جدھر جدھر سے
شہادتیں پتھروں نے دیں تو سلام آیا شجر شجر سے

•••

سناتے رہیے غزل مسلسل جہاں کو لہجہ بدل بدل کے
سرور افزا نوا سنیں گے غموں کے مارے مچل مچل کے

•••

یہ مٹی کیا؟ ہوا کیا ہے؟ فضا کیا ہے؟ خلا کیا ہے؟
مشاہدان کے جو ہوتے سمجھ لیتے خدا کیا ہے

•••

یہ کشش، یہ حسن، یہ رنگ و بو، ابھی تازہ تازہ گلاب ہے
ہے بہار اس پہ ابھی فدا، یہی عز و شانِ شباب ہے

•••

خدا سے ہر چیز پانے والو، خدا سے گفت و شنید بھی ہے؟
وہی ہے سب سے قریب ہر دم، مگر وہ سب سے بعید بھی ہے

•••

خالق نے خود کہا ہے کہ انسان ہے ہلوع
تکلیف ہو اگر کوئی ہو جاتا ہے جزوع

•••

کس کو ملا ہے زندگی میں آج تک فراغ
ھل من مزید کا ہی لگاتے سبھی سراغ

•••

زمین و آسمان کا وہی خدا بدیع ہے
حکیم ہے، قدیر ہے، بصیر ہے، سمیع ہے

•••

کیوں آسمان پر حضور کا دماغ ہے
پیش نظر نگار کا کوئی سراغ ہے

...

انھوں نے چند غزلیں ایسی بھی لکھی ہیں جن میں دو، سہ، چہار، پنج اور شش قافیوں کو برتنے کا التزام ہے۔ یہ غزلیں ان کی قادرالکلامی، فنی مہارت اور قدرتِ کاملہ کا پتا دیتی ہیں۔ ہمارے اردو شعروادب کے لیے صدف ریزے ہیں جن سے ہمارا شعری سرمایہ مالا مال ہوا ہے۔

شفیع مرحوم کی فنی پختگی اور شعری لطافت کی عمدہ دلیل ان غزلوں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے جن میں قوافی کو ردیف کا لازم و ملزوم بنا کر پیش کیا ہے۔ ایسے مقامات پر قوافی کا ردیف کے بغیر اور ردیف کا قوافی کے بغیر تصور محال ہے۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ کریں:

اس کو ہمیشہ اپنے ہی دل کے مکاں میں ڈھونڈ
جنگل، نہ کوہسار، نہ ویراں جہاں میں ڈھونڈ

...

مجھے قتل آپ یوں کیجیے، گرے خون گرد و غبار پر
کوئی چھینٹ داغ نہ بن سکے کہیں اڑ کے دامن یار پر

...

فروزاں کہکشاں ہے اور میں ہوں
کوئی تنویر جاں ہے اور میں ہوں

...

اگر دل میں امنگیں ہوں، سرورستان ہے دنیا
اگر مردہ پڑا ہو دل تو قبرستان ہے دنیا

...

شفیع نے اپنی غزلوں میں تراکیب کا استعمال جس فنکاری اور علمی لیاقت کے ساتھ کیا ہے، جن سے ان کے کلاسیکی ذہن و مزاج، جدت کا پاس و لحاظ اور عربی، فارسی، اردو اور ہندی الفاظ پر یکساں دسترس کا علم ہوتا ہے۔ نیز اس کی پیش کش اور مصرعوں و شعروں میں برتنے کا انداز انھیں سابقون الاولون کی صفِ اولیٰ میں لا کھڑا کرتا ہے۔ بطور مثال چند تراکیب ملاحظہ کریں:

رحمتِ عالمیں، دشتِ خرد، عازمِ صحرا، سنگِ آتشیں، چشمِ سرمگیں، جامۂ نسواں، عروجِ زیست، آلاتِ تلون، خزانۂ ارتفاع، محرومِ انبساط، دیدارِ اطناب، افلاسِ بصیرت، برونِ آستاں، باشندۂ رضواں، شفائے انسانیت، اسوۂ بوتراب، حسناتِ عقبیٰ، ترکِ جلباب، افسوں شکن، حوصلۂ گرداب، خیمۂ دیدہ، دشوارئ حیات، درخشندہ دنداں، فصیلِ عیاذ، کشکولِ بدبختی، عقیقِ ثمن، آتشِ جور،

شفیعِ خوش نوا، شفیعِ نارسا، امیدِ انتفاع، تحفۂ دموع، تضادِ یکساں، دیدارِ طناز، مجموعۂ اوزان، عزمِ حق نوائی، دستِ بخشندگان، ورطۂ بحر، وہم وگمانِ باطل، نوازشِ فصلِ بہار، میکشیِ بادہ خوار، رشتۂ صبح ومسا، خواہشِ پروازِ خوابیدہ، آمادۂ نوازشِ مہر ووفا، افراطِ خورد ونوش، بیگانۂ عیش وعشرت، قاصرِ شعورِ نوائے سروش، چراغِ غیرت وحیا، شعاعِ برقِ تپاں، حسرتِ دیدِ سحر وغیرہ۔

یہ تراکیب ایسے بیش قیمتی خزینے ہیں جن سے اردو شعر وادب سے شغف رکھنے والے قارئین، شائقین، مداحین اور ناقدین ہمیشہ مستفیض ہوتے رہیں گے۔

’آبشارِ نوا‘ میں کئی غزلیں ایسی ہیں جو صرف مطالع پر مشتمل ہیں۔ ان مطالع سے ان کی فنی پختگی، علمی لیاقت اور شعری لطافت کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ بعض غزلوں میں مطلع در مطلع اس طرح خلق کیا ہے کہ کہ سخت سے سخت گیر ناقد بھی ان کے فنی دسترس کا قائل ہو جائے گا۔ اس طرح کی غزلوں کی بابت خود شفیعؔ کا مصرع صادق آتا ہے:۔

کل مطالع غزل کی ندرت ہیں

انھوں نے غزل کی تعریف وتوصیف میں تین میں دو طویل غزلیں لکھی ہیں اور ان میں جس طرح کے لفظیات وتلازمات، قوافی وتراکیب، اور صنائع لفظی ومعنوی کا فنکارانہ استعمال کیا ہے اس سے غزل کا انفرادو اختصاص مزید دوبالا ہو جاتا ہے۔ تینوں غزل کے مطالع حسب ذیل ہیں:

غزل ہے کن فکاں بھی اور ہے تخلیقِ آدم بھی
الم نشرح لک صدرک غزل کا رکنِ اعظم بھی

•••

غزل ہے گنگا جل پیارے، غزل ہے آبِ زمزم بھی
غزل سورج کی کرنیں بھی، غزل گوہر بہ شبنم بھی

•••

غزل آہ وفغاں، حرفِ زیاں، وردِ شبانہ بھی
غزل کیف وطرب میں شادمانی کا ترانہ بھی

•••

ردیف ’’ساقی‘‘ کے دو بہت ہی طویل غزلیں تخلیق ہوئی ہیں، جن میں ساقی کے متعلقات، تراکیب، لفظیات، تلازمات، صنعت مراعات النظیر، حسن تعلیل، لف ونشر مرتب کا استعمال ان کی خلاقانہ انفرادیت کو روشن کرتا ہے۔ اشعار دیکھیں:

•••

سبھی ہوش وخرد، ادراک واحساسات زندہ ہیں
سلا دے سب کو جس کی نوش ایسا جام دے ساقی

•••

اگر اس مے کشی کے بعد مجھ کو ہوش آجائے
سمجھ لوں گا تجھے نادان، مے کو خام اے ساقی

•••

وہی پیمانہ ہو مجھ کو عطا اے مہرباں میرے
جو جوشِ کرب سے میری طرح لبریز ہے ساقی

اسی ضمن میں ان اشعار سے محظوظ ہولیا جائے:

وہ گیسوے مشکبار جاناں، ہلال ابروے دلبرانہ
وہ چشمِ نیر فراز، مژگاں ہے لالہ رخ کا نشاط خانہ

•••

نہ اب محفل کہیں سجتی، نہ شمع ہے، نہ پروانہ
نہ مژگاں تیر ہے، دشنہ نہیں ابروے جانانہ

•••

ہے کون مغاں؟ کب سے ویران ہے میخانہ
ساقی ہے نہ مے کش ہے، ساغر ہے نہ پیمانہ

ایک ایسی اچھوتی طویل ترین غزل پیش کی ہے کہ جس میں تمام مشہور ومعروف شعرا کے تخلص آ گئے ہیں اور ان کا استعمال اس ہنرمندی سے کیا گیا ہے کہ وہ مصارع، تراکیب، لفظیات اور قوافی کا اٹوٹ حصہ بن گئے ہیں۔ یہ غزل شاہکار کا درجہ رکھتی ہے:

•••

ولیؔ کا دردؔ، سوزِؔ میرؔ راسخؔ، آتشِؔ سوداؔ
ظفرؔ کے داغؔ سے اقبالؔ ہیں شمسؔ وقمرؔ والے
سراجؔ مصحفیؔ، انشاؔ کے ناسخؔ، ذوقؔ پرور سب
ہیں رسواؔ، مومنؔ وحالیؔ سبھی تفتہؔ جگرؔ والے

•••

انھوں نے غیر منقوط اور پچلڑی غزلوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ پچلڑی میں بیک وقت اردو، فارسی، عربی، ہندی اور انگریزی زبانوں کا استعمال ایک ہی غزل میں کیا گیا ہے۔ اس میں بھی فنی لوازمات کا مکمل خیال رکھا گیا ہے۔

کسی کو دل اگر دوگے، دکھوں کا سلسلہ دے گا
لگا کر آگ اس گھر کو وہ رہ رہ کر ہوا دے گا

•••

سر سود کا سوداگر ، دل درد کا سودائی
اک لال محل والا، اک لالۂ صحرائی
(غیر منقوط)

اگر خواہی اٹک منزل کے جاری سفر رکھنا
گتی ہو سنتُلِت ، steps پر اپنی نظر رکھنا
(پچلڑی)

اس مجموعہ میں چند غزلیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو بہ اعتبار ردیف تخلیقی جدت کی نمایاں مثال قائم کرتی ہیں۔ایسی غزلوں میں صرف ایک مفرد یا مرکب لفظ کے علاوہ پورا کا پورا مصرع ردیف پر مبنی ہے:

وطن کے نگہباں کہاں سو رہے ہیں
چمن کے نگہباں کہاں سو رہے ہیں

...

بدبداتے چلے گئے ہوں گے
پھسپھساتے چلے گئے ہوں گے

موصوف نے جہاں سنگلاخ زمینوں، مشکل قافیوں اور ردیفوں،طویل بحروں کا استعمال کر کے اپنے کمال فن اور قدرت کاملہ کا ثبوت دیا ہے وہیں آسان، مختصر اور مختصر ترین بحور کا استعمال کر کے سادگی میں پرکاری کے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً:

کوئی دشمن کہاں شفیع اپنا
دوستی بے ضرر نہیں آتی

...

کرو ایسی نظر پیدا
جو کر لے خود سحر پیدا

...

ماں کا آنچل فلک
ہے شفیع آج تک

مرکب الفاظ کی تشکیل میں بھی عالمانہ شان موجود ہے:

اشکاب، آتشاب،قطراب،لفظاب،مرگاب وغیرہ۔

عربی کے ایسے الفاظ کا استعمال جو عام طور پر نہیں کیے جاتے:

انداد، اشراف، اجلاف، عجول،ظلوم،جہول، ہلوع، جزوع، منوع، وغیرہ۔

انگریزی کے الفاظ واصطلاح کے تراجم یا ہو بہو استعمال:

تنازع للبقا، کیمرہ، فیڈیو، لیزر اور میزر وغیرہ

شفیع کی غزلوں میں بعض ایسے اشعار اور مصارع بھی ہیں جو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امید قوی ہے کہ یہ اشعار اور مصارع زبان زد خاص و عام ہو جائیں گے۔ بطور مثال چند اشعار اور مصارع ملاحظہ کریں:

•••

ہوگی، ہوگی، ہوگی بارش، انشاءاللہ
پوری ہوگی دل کی خواہش انشاءاللہ

•••

آگ مسجد میں کیوں لگی ہوگی
شیخ سید میں دشمنی ہوگی

•••

یہ پل پل خرافات، استغفراللہ

•••

اللہ کے احساں ہیں سبھی فضل و کرم بھی

•••

جاں نثاری کی ادا سیکھیے پروانے سے

•••

کیا ملا تن سے جاں جدا کر کے

•••

مجموعہ ’آبشارِ نوا‘ کے مطالعہ سے جہاں مذکورہ اختصاص وانفراد اظہر من الشمس ہیں، وہیں دو اہم محاسن ایسے ہیں جن کا ذکر نہ کرنا ادبی واخلاقی بد دیانتی ہوگی اور اس مجموعہ کے خالق کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ اول: قرآنی آیات، احادیث نبوی کے ٹکڑے اور عربی و فارسی مفرد و مرکب الفاظ کا فنکارانہ استعمال۔ دوم تلمیحاتی اشعار کی پیش کش کا اچھوتا انداز۔

مولانا شفیع مرحوم یقیناً بیک وقت پانچ زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے ہیں لہٰذا انھوں نے اپنی استعداد کی بنیاد پر یہ عظیم شاہکار پیش کیا ہے۔ ان کی غزلوں کی اصل اساس فکری بنیادوں پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ محاسن کو بے حد خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ چند اشعار اور مصارع ملاحظہ کریں:

اگر یہ اوراد سے پگھلتی، تو اسمِ اعظم تلاش کرتے
تبارک اسمک! علاج کر دے تو سر دلہروں کی خودسری کا

•••

الست کا دن بھی یاد آئے، وصالِ جاناں تمھیں ستائے
جگے گا احساس خود ہی دل میں، تمھیں ہو قالوا بلیٰ کے وارث

•••

کہتے ہندی میں لوگ زن کو نار
فقنا ربنا عذاب النار

•••

کس کو ملا ہے زندگی میں آج تک فراغ
ھل من مزید کا ہی لگاتے سبھی سراغ

•••

واحد ہے، لم یزل ہے، احد ہے وہ لا یزال
محبوب اس جمیل کے ہیں صاحب الجمال

•••

ربنا اغفرلنا من العصیان
نرجع کلنا مع الایمان

•••

بیشتر غزلوں میں اس طرح کے اشعار مصرعے، ٹکڑے اور الفاظ کا خاص التزام دیکھنے کو ملتا ہے جس سے ان کی خلاقانہ بصیرت اور قرآن و احادیث کے گہرے مطالعے کا علم ہوتا ہے۔ تلمیحی اشعار میں بھی انھوں نے سحر کاری سے کام لیا ہے۔ تقریباً تمام معروف و مشہور واقعات و حادثات کو تلمیحاتی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس کو پیش کرنے کا انوکھا اور نرالا انداز اختیار کیا ہے۔ تلمیحات پیش کرنے میں غزل کے مزاج و تہذیب کا ہر مقام پر خیال رکھا گیا ہے۔ ان تلمیحات کو اس طور پیش کیا ہے کہ وہ تاریخی واقعات و حادثات، قصائص و حکایات اور معجزات عصری احوال و کوائف اور مسائل و معاملات کی آماجگاہ بن گئی ہیں۔ چند اشعار دیکھیں:

•••

پہلے میں نے نمرودوں، فرعونوں سے رشتے توڑے
ابراہیم و موسیٰ کے کردار کو جگ میں عام کیا
•••

دے حوصلہ اللہ! اسے جھیلوں بہ جرأت
ایوب سا ہو صبر، عطا کر وہ ہنر آج

•••

آدم تو فرشتوں سے اعلیٰ و دوبالا تھا
ابلیس کبھی تنہا اس دہر میں رسوا تھا

•••

منصورسی خواہشِ دار نہیں، مجنوں سے دشت وخار نہیں
بن اسوۂ احمد کا حامل، بسمل کی طرح تو یوں نہ تڑپ

•••

تھی قلوپطرہ سیاسی مصلحت کی داشتہ
کل تھا قیصر، آج اس کا تن سپہ سالار کا

مولانا شفیع کی تخلیقات کے بالاستیعاب مطالعے سے یہ نتائج بہ آسانی اخذ وجذب کیے جاسکتے ہیں کہ انھوں نے جس ڈگر کا انتخاب کیا ہے وہ سورج کو چراغ دکھانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کی روشنی میں اپنی منزل تک جانے کے لیے صحیح راستے کا انتخاب ہے۔ البتہ، اس ڈگر پر خون جگر صرف کرنے اور برق تجلی سے آشنا ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ڈگر ذاتی تجربے کی بنیاد پر منتخب کی گئی ہے جہاں وہ مکمل طور پر کامیاب وکامران ہیں۔ انھوں نے تجرباتی محاذ پر جو جوت جگائی ہے وہ یقیناً اچھوتی ہے جو لائق تحسین بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی۔

مولانا مرحوم کو قدرت کی جانب سے خلاقانہ بصیرت اور صلاحیت ودیعت ہوئی تھی۔ لہٰذا انھوں نے ایسے کارنامے انجام دیے جن کی نظیر نہیں ملتی۔ اردو غزل جس شان وشکوہ، الفاظ وتراکیب کی بندش، بیان کی جدت، سوز وگداز، ترنم وموسیقیت، لطافت و نزاکت، انوکھی تشبیہات واستعارات، معنی آفرین، جدت تراکیب، جوش بیان، ندرت ادا، غزل کے مزاج کے مطابق بحروں، ردیفوں اور قوافی کا التزام وغیرہ کی متقاضی ہے، انھوں نے پورے خلوص وصداقت اور فنی چابکدستی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہندی کے اشعار بھی آسانی سے کہہ لیتے ہیں، جو خوبصورت اردو بھی ہے:

•••

یہ جادوگر کی گگری ہے جو سب کے سامنے چھلکے
وہاں پانی نہیں سمجھو، وہ سب دھوکے ہیں بس چھل کے

•••

کٹار آنکھوں میں اپنی لے کے وہ گھر سے نکلتے ہیں
بچا لو آپ کو، جادو بھی، منتر بھی ہیں کاجل کے

اب کچھ اور اشعار ملاحظہ فرمائیں جن میں آپ کو ضرور کوئی خاص بات نظر آئے گی:

•••

نہ تخت آزاد بخت جیسا، نہ ہے خردمند سی وزارت
ہے خواب باغ و بہار ہر سو، خزاں گزیدہ ہے کدکو و

•••

شفیعؔ دشمن نہیں کسی کا، نہ لب پہ شکوہ ہے بے بسی کا
وطن کی خاطر ہے جان حاضر، دے اس کے دشمن کو رب ہدایت

•••

نظر اس جلوۂ جاں بخش جاناں کو ترستی ہے
کہ جس کی روشنی میں کشف ہو کیا راز ہستی ہے

•••

کب اپنی ناک، آنکھ پہ انساں کی ہے نظر
اوروں کی لغزشوں پہ تو شورِ ضمیر ہے

•••

مولانا شفیعؔ مرحوم نے فارسی غزلوں کا اردو غزلوں میں مفہوم کے تحت شمسؔ تبریزی (مولانا روم)، امیر خسروؔ، حافظؔ وغیرہ کے کلام کو اس انداز سے پیش کیا ہے جو کسی بھی طرح ترجمہ نہیں دکھتا۔ جب اصل شعر کو سامنے رکھیے تو بالکل لفظی ترجمہ کے قریب دکھائی دیتا ہے: مثلاً

شمسؔ تبریز:

شرابِ شیرۂ انگور چاہوں
عدوے نشاے مخمور چاہوں

امیر خسروؔ:

احباب سب ہمارے کہاں بے پتا ہوئے
کیا دن تھا! رب! وہ ہم سے اچانک جدا ہوئے

حافظ شیرازی:

یوسفِ گم گشتہ آ جائے گا کنعاں، غم نہ کر
کلبۂ احزاں کبھی ہوگا گلستاں، غم نہ کر

...

تلخ مے شیریں لبوں سے جب ملے
دے حلاوت میں وہ مصری کو بھی مات

...

غالبؔ نے اپنے فارسی کلام کی پیش گوئی ایک پوری غزل میں کی ہے جس کے چند اشعار ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں، یہ اشعار محمد شفیع الرحمان شفیعؔ کی شاعری کے لیے مناسب و موافق ہیں:

تازہ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواھد شدن   این می از قحط خریداری کہن خواھد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است   شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواھد شدن
مطرب از شعرم بہر بزمی کہ خواھد زد نوا   چا کہا ایثار حبیب پیرھن خواھد شدن

شفیعؔ صاحب نے غزلوں میں کمال فن اور ذہنی طباعی کا لازوال نمونہ قائم کیا ہے، قارئین و ناقدین کو یقیناً بے انتہا مسرت حاصل ہوگی۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے   سفینہ چاہیے اک بحر بیکراں کے لیے

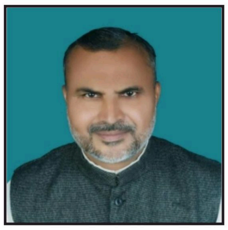

تحریکِ آزادی میں اردوصحافت کا رول

عـزیرانجم
موتیہاری چمپارن

تمہیداور تعارف:

اردوصحافت برصغیر کی علمی، ادبی اور سیاسی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔جس دور میں قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی، اس وقت اردوصحافت نے نہ صرف عوام کو بیدار کیا بلکہ ایک فکری اورانقلابی فضا بھی قائم کی۔ اردوزبان جو پہلے ہی دلوں کی زبان تھی جب صحافتی قالب میں ڈھلی تواس نےعوام کی ترجمانی کامؤثر ترین ذریعہ بن کرتاریخ میں اپنی ایک منفردشناخت قائم کی۔

اردوصحافت کی مختصر تاریخ:

اردوصحافت کا آغاز 1822ء میں کلکتہ سے ”جامِ جہاں نما“ کے ذریعے ہوا۔ ابتدا میں اس کا دائرہ محدوداوراسلوب سادہ تھامگر جلد ہی یہ زبان عوام کی آواز بن گئی۔ انیسویں صدی کے وسط تک اردواخبارات دہلی، لکھنؤ، لاہوراور دیگراہم شہروں میں سرگرم ہو چکے تھے۔ان اخبارات نے نہ صرف خبریں پہنچائیں بلکہ رائے سازی، شعور کی بیداری اورقومی مزاحمت میں بھی کلیدی کرداراداکیا۔اردوصحافت کا یہ سفرصرف خبروں کی ترسیل تک محدود نہ رہا بلکہ ایک فکری تحریک میں تبدیل ہوگیا۔

برصغیر میں انگریزی سامراج کا پس منظر:

جب برصغیر میں انگریزوں کی سیاسی گرفت مضبوط ہوئی توان کے ساتھ علمی، تمدنی اورصحافتی استعمار بھی آیا۔انہوں نے اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے نہ صرف تعلیمی نظام کوتبدیل کیا بلکہ آزادئ اظہار پر بھی پابندیاں لگائیں۔ ایسے حالات میں جب خوف اور سنسرشپ عام تھی، اردوصحافت نے اپنی راہ نکالی اورعوامی مسائل کواجاگر کرنا شروع کیا۔اس نے انگریزی تسلط کے خلاف بغاوت کے بیج بوئے اورفکری سطح پرایک مضبوط مزاحمت کی بنیادرکھی۔

تحریک آزادی کا تعارف:

تحریک آزادی صرف بندوقوں کی لڑائی نہیں تھی بلکہ یہ ایک فکری، سیاسی اورتہذیبی جنگ بھی تھی۔ اس تحریک میں جہاں علماء، طلباء، خواتین اورسیاسی رہنماسرگرم تھے، وہیں صحافی بھی صفِ اول میں شامل تھے۔انہوں نے اپنے قلم کے ذریعےعوام کو بیدار

کیا،ظلم کو بے نقاب کیا اور آزادی کی تڑپ کو تحریر میں ڈھالا۔ اردو صحافت نے تحریک آزادی کو وہ زبان عطا کی جس سے انقلاب کے نعرے گونجے اور شعور کی شمعیں روشن ہوئیں۔

اردو صحافت کی ضرورت اور افادیت:

اس دور میں جب کہ بیشتر عوام ناخواندہ تھے، اردو صحافت نے آسان زبان میں پیچیدہ سیاسی و سماجی مسائل کو پیش کیا۔ اخبارات اور رسائل نے نہ صرف معلومات فراہم کیں بلکہ قومی شعور کو بیدار کیا۔ اردو کی نرمی، وسعت اور اثر انگیزی نے صحافت کو عوامی بنایا۔ یہی وجہ تھی کہ اردو اخبارات عوامی جذبات، محرومیوں اور امنگوں کے حقیقی ترجمان بن گئے۔ اردو صحافت نے ایک طرف سامراجی پالیسیوں پر تنقید کی تو دوسری جانب امید اور حوصلے کا چراغ بھی جلایا۔

مقالہ کا مقصد و اہمیت:

زیر نظر مقالہ اردو صحافت کے اس تاریخی اور انقلابی کردار کا جائزہ لینے کے لیے لکھا گیا ہے جس نے برصغیر کی تحریک آزادی میں ایک خاموش مگر بھرپور جنگ لڑی۔ اس کا مقصد صرف تاریخی واقعات کی فہرست پیش کرنا نہیں بلکہ ان عوامل کو اجاگر کرنا ہے جن کی بدولت اردو صحافت عوامی مزاحمت کا مؤثر ذریعہ بنی۔ اس مقالہ کے ذریعے آج کی نسل کو اس ورثے سے روشناس کرانا مقصود ہے جو ہمیں قربانی، جدوجہد اور بصیرت کا سبق دیتا ہے۔ اردو صحافت کا ماضی ہمارے حال کے لیے ایک آئینہ ہے اور اس آئینہ کو صاف اور واضح رکھنا ہمارا فکری اور تعلیمی فریضہ ہے۔

اردو صحافت کا آغاز اور ارتقاء:

اردو صحافت کا آغاز اور اس کا ارتقائی سفر برصغیر کی تاریخ کا ایک نہایت اہم اور روشن باب ہے۔ یہ وہ میدان ہے جہاں قلم نے تلوار کا کام کیا اور جہاں سیاہی نے خون سے زیادہ مؤثر انداز میں انقلاب کی بنیادیں رکھیں۔ اردو صحافت نے اپنے ابتدائی دور ہی سے نہ صرف خبروں کی ترسیل کا کام انجام دیا بلکہ عوامی شعور کو بیدار کرنے، انگریز سامراج کے مظالم کو بے نقاب کرنے اور قومی حمیت کو جگانے میں فعال کردار ادا کیا۔ اس سفر کا آغاز اگرچہ سادہ، محدود اور احتیاط سے بھرپور تھا لیکن وقت کے ساتھ یہ ایک پختہ، باوقار اور انقلابی تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔

اردو صحافت کا آغاز، ایک نیا عہد:

اردو صحافت کا باضابطہ آغاز 27 مارچ 1822ء کو کلکتہ سے شائع ہونے والا پہلا اردو اخبار "جامِ جہاں نما" سے ہوا جو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ اسے کلکتہ کے مشہور مطبع "مشن پریس" سے نکالا گیا۔ اگرچہ اس کا اولین مقصد علمی اور عمومی خبریں فراہم کرنا تھا لیکن یہ اردو صحافت کی بنیاد ثابت ہوا۔ یہ اخبار دراصل اردو زبان کو صحافتی سانچے میں ڈھالنے کی پہلی کوشش تھی۔

بعدازاں مختلف علاقوں سے اردو اخبارات نکلنے لگے اور اس نئے ذرائع ابلاغ نے عوام کو ایک ایسی زبان عطا کی جو نہ صرف ان کے جذبات کی ترجمان تھی بلکہ ان کے مسائل، محرومیوں اور امنگوں کی آواز بھی بن گئی۔ اردو صحافت نے عوام کو وہ آنکھیں دیں جن سے وہ سیاسی حالات کو سمجھ سکیں، وہ زبان دی جس سے وہ حکمرانوں کو مخاطب کر سکیں اور وہ شعور دیا جس سے وہ اپنے حقوق کی پہچان حاصل کر سکیں۔

کلکتہ، لکھنؤ، دہلی اور لاہور صحافت کے مراکز:

انیسویں صدی کے وسط تک اردو صحافت نے کلکتہ، دہلی، لکھنؤ اور لاہور جیسے علمی و ادبی مراکز میں اپنے قدم جما لیے تھے۔ ہر شہر میں نکلنے والے اخبارات نے اپنے مخصوص اسلوب، نظریاتی رجحان اور عوامی وابستگی کے سبب جداگانہ حیثیت حاصل کی۔

کلکتہ چونکہ علمی و سیاسی لحاظ سے برطانوی حکومت کا مرکز تھا، اس لیے یہاں کے اخبارات میں اعتدال اور احتیاط کا پہلو غالب تھا۔ دہلی اور لکھنؤ کی صحافت میں ادبی رنگ نمایاں تھا لیکن انگریز مخالف جذبات بھی برابر شامل رہے۔ لاہور کا صحافتی مزاج نسبتاً تیز اور انقلابی رہا جہاں "زمیندار" جیسے اخبارات نے حکومت وقت کو براہِ راست للکارا۔

یہ تمام علاقے اردو صحافت کے مراکز بنے اور ہر خطے کی صحافت نے وہاں کی تہذیب، سیاست اور مزاج کے مطابق اپنا رنگ اختیار کیا۔ اخبارات اور جرائد نے ادبی محفلوں سے نکل کر عوامی میدانوں میں اپنی جگہ بنائی اور ایک زندہ اور متحرک معاشرتی قوت بن گئے۔

ارتقاء کی منازل، صحافت سے بغاوت تک:

ابتدائی اردو صحافت اگرچہ محدود تھی لیکن بہت جلد اس نے اپنی وسعت، گہرائی اور اثر انگیزی سے سب کو حیران کر دیا۔ ابتدا میں صحافت کا محور تعلیمی، تمدنی اور اخلاقی موضوعات ہوا کرتا تھا لیکن جوں جوں سامراجی مظالم میں اضافہ ہوا، اردو صحافت نے سیاسی مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ اخبارات میں اداریے لکھے جانے لگے، تجزیاتی تحریریں شامل ہوئیں اور قارئین سے براہ راست مکالمہ کا انداز اختیار کیا گیا۔ اسلوب میں تلخی آئی مگر صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹا۔ بہت سے صحافیوں کو قید، جلاوطنی اور مالی خسارے کا سامنا کرنا پڑا مگر صحافت کا قافلہ رکا نہیں۔

ارتقاء کی اس راہ میں اردو صحافت نے ادب، مذہب، سیاست اور ثقافت ہر میدان کو اپنے دامن میں سمیٹا۔ یہ نہ صرف خبروں کی ترجمان بنی بلکہ فکر و شعور کی راہنما بھی۔ اردو صحافت نے مزاح، طنز، افسانہ، کالم، فیچر اور انٹرویو جیسے فنون کو جنم دیا اور ایک جامع صحافتی نظام کی بنیاد رکھی۔

1857 کی جنگِ آزادی اور اردو صحافت:

1857ء کی جنگِ آزادی برصغیر کی تاریخ کا وہ فیصلہ کن لمحہ ہے جب ایک طرف قوم نے اپنی بقا، شناخت اور آزادی کے

لیےعلمِ بغاوت بلند کیا اور دوسری طرف سامراج نے اپنی پوری قوت کے ساتھ ظلم، جبر اور انتقام کا طوفان برپا کیا۔ یہ صرف توپ و تلوار کی جنگ نہ تھی بلکہ فکروں، نظریوں اور بیانیوں کی بھی جنگ تھی۔ اسی دور میں اردو صحافت جو اب تک خاموش، محتاط اور علمی دائرے میں محدود تھی، اچانک ایک ایسی فکری اور قومی آواز بن کر ابھری جس نے قوم کو جھنجھوڑ دیا۔

اردو صحافت کا انقلابی کردار، قلم سے مزاحمت کی ابتدا:

جب 1857ء میں جنگِ آزادی کی چنگاری دہلی، میرٹھ، لکھنؤ، کانپور، جھانسی اور دیگر علاقوں میں بھڑکی تو برطانوی سامراج کے خلاف عوامی غیظ وغضب کا جو طوفان اٹھا، اسے زبان دینے کا کام اردو صحافت نے انجام دیا۔ ان دنوں اخبار صرف خبر کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ وہ عوام کی فکر، جذبات اور رجانات کی ترجمانی بھی کرتے تھے۔

اردو اخبارات نے عوام کے اندر آزادی کی تڑپ پیدا کی، انہیں ان کے حقوق سے روشناس کرایا اور حکمرانوں کی پالیسیوں کو بے نقاب کیا۔ ان اخبارات کے مضامین، اداریے، کالم اور شاعرانہ تحریریں عوام کو تحریک دے رہی تھیں۔ جو بات علماء اپنے خطبوں میں کہہ رہے تھے، وہی بات صحافی اپنے کالموں میں لکھ رہے تھے۔ اس طرح منبر اور اخبار، دونوں ایک ہی مقصد کی تکمیل میں جُٹے ہوئے تھے۔

مولوی محمد باقر کی شہادت اردو صحافت کا پہلا خون:

1857ء کی جنگِ آزادی میں اگر کسی ایک فرد نے اپنی جان صرف اس لیے قربان کی کہ وہ حق لکھتا تھا، سچ بولتا تھا تو وہ مولوی محمد باقر تھے" دہلی اردو اخبار" کے بانی مدیر اور وہ مجاہد صحافی جنہیں اردو صحافت کا پہلا شہید قرار دیا جاتا ہے۔

مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار کے ذریعے جنگِ آزادی کی حمایت کی، عوامی جذبات کی عکاسی کی، انگریزوں کے مظالم کو بے نقاب کیا اور آزادی کی آواز کو الفاظ دیے، یہ بات انگریز حکام کو ناقابلِ برداشت تھی، چنانچہ انہیں گرفتار کیا گیا اور بغیر کسی باقاعدہ مقدمہ کے انہیں گولی مار دی گئی۔ اس طرح اردو صحافت کا سفر جو ابھی پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا، خون سے رنگ دیا گیا۔

مولوی محمد باقر کی شہادت صرف ایک فرد کی موت نہ تھی بلکہ وہ ایک نظریے، ایک مقصد اور ایک صحافتی اصول کی بقا کی علامت بن گئی۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ صحافت صرف اخبار نویسی نہیں بلکہ سچائی کی حفاظت کے لیے قربانی کا مطالبہ بھی کرتی ہے۔

انگریزوں کی سختیاں اور سنسر شپ سچائی کی راہوں میں رکاوٹیں:

1857ء کے بعد انگریزوں نے نہ صرف جنگی میدانوں میں بدلہ لیا بلکہ فکری میدانوں میں بھی سخت ترین قوانین نافذ کیے۔ اخبارات کی اشاعت پر پابندیاں لگائی گئیں ہر خبر کو سنسر کیا جانے لگا اور وہ تمام صحافی جو حکومت سے اختلاف رکھتے تھے انہیں گرفتار کر کے قید و بند کی صعوبتوں میں ڈالا گیا۔ صحافت کے لیے سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔

پریس ایکٹ اور دیگر قوانین کے ذریعے اردو صحافت کا گلا گھونٹنے کی بھرپور کوشش کی گئی لیکن اس کے باوجود صحافیوں نے

ہمت نہ ہاری۔ وہ نئے ناموں سے، نئے انداز میں اور کہیں کہیں اشاروں، کنایوں اور تمثیلوں کے ذریعے اپنی بات عوام تک پہنچاتے رہے۔ انگریز یہ سمجھ رہے تھے کہ کاغذ اور قلم پر پابندی سے فکر کو قید کیا جا سکتا ہے لیکن وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے کہ جب سچائی دلوں میں گھر کر لیتی ہے تو اس کی گونج کو کوئی زنجیر خاموش نہیں کر سکتی۔

اردو صحافت اور عوامی شعور:

1857ء کی ناکامی کے بعد اگرچہ آزادی کی تحریک وقتی طور پر دب گئی لیکن اردو صحافت نے اس جدوجہد کی آگ کو بجھنے نہ دیا۔ وہ جذبہ جو مٹنے والا تھا اسے اردو اخبارات نے اپنے صفحات میں محفوظ رکھا۔ شاعری، نثر، سفرنامے اور تجزیے ہر صنف میں تحریکِ آزادی کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔

اردو صحافت نے نہ صرف خواص بلکہ عوام کو بھی متاثر کیا۔ خواندہ اور ناخواندہ دونوں طبقات اردو زبان سے مانوس تھے، اس لیے اردو اخبارات کی رسائی اسکولوں، کالجوں، مدرسوں، کتب خانوں، گلی، کوچوں، چوک چوراہوں، چائے خانوں، مسجدوں اور علمی حلقوں تک تھی۔ زبان کی یہ ہمہ گیری اردو صحافت کی سب سے بڑی طاقت تھی اور اسی بنیاد پر وہ عوامی شعور کی تعمیر میں سب سے آگے رہی۔

بیسویں صدی کے ابتدائی اخبارات:

جس قوم کے افق پر 1857ء کی ناکام بغاوت نے غم و یاس کی دھند چھا دی تھی، وہ قوم بیسویں صدی کے اوائل میں ایک نئے عزم، تازہ ولولے اور زندہ شعور کے ساتھ ابھری۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آزادی کی تحریک نے فکری پختگی حاصل کر لی تھی اور اس فکری تحریک کو زبان دینے کا سب سے مؤثر ذریعہ اردو صحافت بن چکی تھی۔ اردو اخبارات نے اب صرف خبروں کی رپورٹنگ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے نظریات کی آبیاری، سیاسی بیداری اور قومی اتحاد کی بنیاد رکھنے میں وہ کردار ادا کیا جو کسی انقلابی تحریک کے لیے لازمی ہوتا ہے۔

الہلال، البلاغ، زمیندار، اودھ پنچ کی تحریروں میں طوفان:

اردو صحافت میں بیسویں صدی کا ابتدائی دور ایک طرح کا انقلابی عہد ہے، اس دور میں کئی ایسے اخبارات اور رسائل منظر عام پر آئے جنہوں نے برطانوی سامراج کو فکری محاذ پر چیلنج کیا اور عوام کے دلوں میں جذبۂ آزادی کو نئی زندگی بخشی۔

ا۔ الہلال (1912)

مولانا ابوالکلام آزاد کا جاری کردہ یہ اخبار محض ایک اشاعتی ادارہ نہیں بلکہ ایک فکری تحریک تھا۔ الہلال کی زبان، اسلوب اور موضوعات سب کچھ انوکھے تھے۔ مولانا آزاد کی تحریروں میں مذہب، تاریخ، سیاست اور فلسفہ کی آمیزش ایسی لطیف ہوتی کہ

قاری محض خبر نہیں پڑھتا بلکہ ایک فکری انقلاب کا حصہ بن جاتا۔ الہلال نے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا، ہندو مسلم اتحاد کا پرچار کیا اور آزادی کی تحریک کو ایک فکری سمت دی۔

۲۔البلاغ (1915)

جب حکومت نے "الہلال" پر پابندی لگا دی تو مولانا آزاد نے ایک نئے نام سے "البلاغ" نکالا۔ البلاغ نے الہلال کی روایت کو مزید گہرائی، وسعت اور تاثیر کے ساتھ جاری رکھا۔ البلاغ میں مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور دینی اصلاح کا کام بھی جاری رہا اور آزادی کے لیے عوامی ذہن سازی بھی۔

۳۔زمیندار (1903)

لاہور سے مولانا ظفر علی خان کی ادارت میں نکلنے والا یہ اخبار انگریز حکومت کے لیے ایک ایسی للکار تھا جس کی بازگشت دلی کے ایوانوں سے لے کر لندن کے پارلیمنٹ ہاؤس تک سنائی دیتی تھی۔

زمیندار کا اسلوب جذباتی، ولولہ انگیز اور عوامی تھا۔ اس میں ایسی نظمیں، مضامین اور خبروں کا انتخاب ہوتا جو حکومت کے خلاف احتجاج کا سماں باندھ دیتی تھیں۔

مولانا ظفر علی خان نے اردو صحافت کو نعرہ، شعلہ اور شمشیر بنا دیا۔ انہوں نے صحافت کو شعر کے قالب میں ڈھالا اور عوام کے جذبات کو حکمرانوں کے خلاف صف آرا کر دیا۔

۴۔اودھ پنچ (1877)

اگرچہ یہ اخبار انیسویں صدی کے آخر میں جاری ہوا مگر اس کا اثر بیسویں صدی میں بھی نمایاں رہا۔ یہ طنز و مزاح کا جادوگر تھا جو سنجیدہ مضامین کی بجائے تمثیل، مزاحیہ مکالمے اور استعاروں سے کام لیتا تھا۔

اودھ پنچ نے ظاہراً ہنسنے ہنسانے کی تحریریں شائع کیں لیکن ان میں چھپی ہوئی تنقید اور طنز کے تیر برطانوی سامراج کے قلب کو چیر جاتے تھے۔

اسلوب اور اثر:

ان اخبارات نے ایک نیا صحافتی اسلوب متعارف کرایا، ایسا اسلوب جو علمی بھی تھا، انقلابی بھی اور عوامی بھی۔ ان کی تحریریں نہ صرف سنجیدہ قارئین کے لیے تھیں بلکہ عام آدمی کے دل کو بھی چُھو لیتی تھیں جہاں "الہلال" نے علم و فکر کے دریچے وا کیے وہیں "زمیندار" نے عوام کے جذبات کو زبان دی اور اودھ پنچ نے ہنسی کی آڑ میں حکومت پر کاری ضربیں لگائیں۔

ان اخبارات نے سیاسی فضا کو اتھل پتھل کر دیا، ان کی ہر اشاعت عوام میں بے چینی، جوش، امید اور بغاوت کے جذبات

بھڑکاتی تھی۔ان کا انتظار لوگ بے چینی سے کرتے اور ان کی ہر تحریر ایک نیا پیغام لے کر آتی۔یہی وہ دور ہے جب اردو صحافت نے ثابت کیا کہ وہ صرف "اطلاعات کی ترسیل" نہیں بلکہ "قومی قیادت" کی ذمہ داری بھی ادا کر سکتی ہے۔

عوامی ذہن سازی انگریز حکومت کے خلاف ایک فکری مورچہ:

ان اخبارات کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے عوامی ذہن سازی کی، انگریز کی چالاک پالیسیوں "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی سازشوں اور مسلمانوں و ہندوؤں کے درمیان مصنوعی خلیج پیدا کرنے کی کوششوں کو بے نقاب کیا۔الہلال اور البلاغ نے مسلمانوں کو احساس دلایا کہ وہ محض رعایا نہیں بلکہ ایک باوقار قوم ہیں جنہیں اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنا ہے۔

زمیندار نے یہ پیغام دیا کہ آزادی صرف خواص کا مسئلہ نہیں بلکہ ہر کسان، مزدور اور عام آدمی کی ضرورت ہے۔اودھ پنچ نے حکمرانوں کے دعوؤں کی چادر کو چاک کر کے عوام کو یہ دکھایا کہ ظالم کی مسکراہٹ کے پیچھے ظلم کے خنجر چھپے ہوتے ہیں۔

آزادی کی جدوجہد میں نئی روح، صحافت ایک تحریک کے طور پر:

ان اخبارات نے تحریکِ آزادی میں ایک نئی روح پھونکی جہاں سیاسی پارٹیاں جلسے جلوس کرتی تھیں، وہاں یہ اخبارات روزانہ کی بنیاد پر عوام کے دلوں میں انقلابی جذبات پیدا کرتے تھے۔

ان اخبارات کی اشاعت بند کرنے، مدیران کو قید کرنے، جرمانے عائد کرنے اور سنسر شپ کے باوجود یہ اخبارات نئے ناموں، نئی صورتوں اور نئے شہروں سے دوبارہ جنم لیتے رہے۔

یہی وہ بے خوفی، استقلال اور سچائی تھی جس نے اردو صحافت کو محض "ذرائع ابلاغ" کے دائرے سے نکال کر "تحریکِ آزادی کا ہراول دستہ" بنا دیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا کردار:

تحریکِ آزادی کی تاریخ صرف تلواروں، قید و بند اور میدانِ جنگ کی کہانی نہیں ہے بلکہ یہ قلم، فکر اور زبان کی جنگ کا بھی نام ہے۔اسی فکری معرکے میں ایک ایسا نام ابھرتا ہے جو نہ صرف ایک مجاہدِ آزادی تھا بلکہ ایک مفکر، مفسر، مصلح اور صحافی بھی تھا۔وہ نام مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے جنہوں نے اردو صحافت کو ایک نئی جہت، نئی روح اور نیا وقار عطا کیا۔ان کی صحافت محض خبریں فراہم کرنے کی کاوش نہ تھی بلکہ وہ ایک نظریاتی اور انقلابی مشن کا حصہ تھی۔

مولانا آزاد نے اردو صحافت کو صرف قلم کی طاقت نہیں بلکہ ایک فکری اور دینی فریضہ بنایا اور اسے قومی بیداری، فکری اصلاح اور سیاسی رہنمائی کا ذریعہ بنا دیا۔

الہلال ایک فکری و انقلابی معجزہ:

1912ء میں جب مولانا آزاد نے الہلال کے نام سے کلکتہ سے اردو ہفت روزہ جاری کیا تو اردو صحافت کا مزاج ہی بدل گیا۔ یہ اخبار محض ایک رسالہ نہ تھا بلکہ ایک فکری انقلاب کا پرچم بردار تھا۔ اس میں مذہب، سیاست، فلسفہ، تاریخ، آزادی، قومیت اور اتحاد جیسے موضوعات پر ایسی بلند پایہ تحریریں شامل ہوتیں جنہوں نے پورے برصغیر میں ایک فکری ہلچل مچا دی۔

مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعے مسلمانوں کو بتایا کہ اسلام صرف چند عبادات یا رسوم کا نام نہیں بلکہ ایک انقلابی پیغام ہے جو عدل، مساوات اور آزادی کا علمبردار ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اسلام کا پیغام ظلم کے خلاف ہے چاہے وہ ظلم سیاسی ہو یا تہذیبی، انگریزوں کا ہو یا کسی اور طاقت کا۔ الہلال کی زبان علمی، شائستہ اور فکری اعتبار سے نہایت بلند تھی۔ مولانا آزاد کی تحریروں میں ایک ایسا جلال و جمال تھا جو قاری کے ذہن و دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا، ان کا انداز نہ صرف معلوماتی تھا بلکہ وجدانی بھی جس سے قاری صرف کچھ سیکھتا نہ تھا بلکہ وہ اندر سے بدلتا بھی تھا۔

البلاغ جدوجہد کا تسلسل:

1914ء میں جب حکومت نے الہلال پر پابندی لگا دی تو مولانا آزاد نے البلاغ کے نام سے ایک اور ہفت روزہ شائع کرنا شروع کیا۔ البلاغ، الہلال کی روحانی توسیع تھی، اس میں بھی وہی علمی وقار، وہی دینی فراست، وہی سیاسی بصیرت اور وہی انقلابی شعلہ موجود تھا۔ البلاغ نے نہ صرف مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا بلکہ ہندو مسلم اتحاد کو بھی مضبوط کیا۔

مولانا آزاد نے اپنے قلم کے ذریعے انگریزوں کی تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی تحریریں نہ صرف مسلم قوم کے لیے بلکہ برصغیر کے تمام مظلوم طبقات کے لیے ایک بیداری کا نقارہ تھیں۔

حکومت کی پابندیاں، جب سچائی سزا بن جائے:

مولانا آزاد کی تحریروں نے جب انگریز حکومت کے مظالم، استبدادی پالیسیوں اور سامراجی عزائم کو بے نقاب کیا تو انگریزوں نے انہیں خاموش کرانے کی کوشش کی۔ الہلال اور البلاغ دونوں پر پابندیاں لگائی گئیں، اخبارات بند کیے گئے اور مولانا کو قید و بند کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کا قلم کبھی جھکا نہیں۔

ان کی شخصیت اس آیتِ قرآنی کی عملی تصویر تھی:

"قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا"

(وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر جم جاتے ہیں)

مولانا آزاد نے صحافت کو محض اظہارِ رائے کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ اسے جہاد فی سبیل اللہ کا ایک جدید اور فکری میدان بنایا۔ انہوں نے اپنے قلم کے ذریعے فکری استعمار کو للکارا اور قوم کو ذہنی غلامی سے آزاد کرنے کی بنیاد رکھی۔ تحریروں میں مذہب، سیاست اور جذبۂ حریت کی جھلک، مولانا آزاد کی تحریروں میں یہ تین بنیادی عناصر ہمیشہ نمایاں رہے۔

۱۔مذہب کی روشنی:

اسلام ان کے نزدیک صرف چند عقائد یا عبادات کا مجموعہ نہ تھا بلکہ ایک مکمل ضابطۂ حیات تھا۔ان کے مضامین میں قرآنی آیات،سیرت النبیؐ اور اسلامی تاریخ کی مثالیں عام ملتی ہیں جو قاری کو مذہبی جذبے سے سرشار کرتی ہیں۔

۲۔سیاست کی بصیرت:

انہوں نے انگریزوں کی پالیسیوں کو نہایت باریک بینی سے پرکھا اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ان کی سیاسی تحریریں کسی سیاسی دانشور سے کم نہ تھیں۔

۳۔حریت کا جذبہ:

آزادی مولانا آزاد کی تحریروں کا محور و مرکز تھی،ان کے الفاظ میں آزادی کی پیاس،خودداری کی للکار اور قربانی کا جوش رچا بسا ہوتا۔ان کے مضامین قاری کے دل میں تلاطم برپا کرتے،اسے بے قرار کرتے اور پھر اسے عمل پر آمادہ کرتے۔

مولانا ظفر علی خان اور اخبار زمیندار:

تحریکِ آزادی کا ہر پہلو چاہے وہ میدانِ جنگ ہو یا ایوانِ اقتدار درحقیقت ایک داستانِ قربانی ہے لیکن ایک اور پہلو ایسا بھی ہے جو نہ شمشیر سے وابستہ ہے،نہ بندوق سے بلکہ قلم سے جو دلوں میں بغاوت،آنکھوں میں بیداری اور ذہنوں میں روشنی پیدا کرتا ہے۔اس پہلو میں ایک ایسا نام ابھرتا ہے جو قلم سے لڑا،کاغذ پر زخمی ہوا اور صحافت کو حریت کا ہتھیار بنادیا۔وہ نام مولانا ظفر علی خان کا ہے اور ان کا عظیم ہتھیار تھا اخبار"زمیندار"۔

"زمیندار" بیداریِ ملت کا نقیب:

1903ء میں لاہور سے جاری ہونے والا ہفت روزہ زمیندار اصل میں انگریز حکومت کی زرعی پالیسیوں کے خلاف ایک آواز کے طور پر شروع ہوا لیکن مولانا ظفر علی خان نے اسے محض کسانوں کی ترجمانی تک محدود نہ رہنے دیا بلکہ ایک قومی،دینی،تہذیبی اور سیاسی تحریک میں بدل دیا۔

انہوں نے اس اخبار کو مسلمانوں کے درد،ملت کے مسائل اور تحریکِ آزادی کے جذبات کا ایسا عکاس بنایا کہ ہر بیدار دل شخص کا وہ اخبار بن گیا۔

زمیندار کے ادارتی مضامین،نظموں اور تبصروں نے عوام کے دلوں میں بیداری کی ایک ایسی لہر دوڑا دی کہ انگریز حکام اسے دشمنِ سلطنت سمجھنے لگے لیکن مولانا ظفر علی خان کے الفاظ میں جو صداقت،جرأت اور خلوص تھا وہ کسی بھی دباؤ کو خاطر میں نہ لاتے۔

مولانا ظفر علی خان مردِ آہن اور شاعرِ حریت:

مولانا ظفر علی خان صرف صحافی نہ تھے وہ ایک ادیب، شاعر، مقرر، مترجم اور سب سے بڑھ کر مجاہدِ آزادی تھے۔ ان کی شخصیت میں قائدانہ فراست، ادبی گہرائی، دینی شعور اور قومی غیرت ہم آہنگ تھی۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کے دینی، سیاسی اور تہذیبی شعور کو جگانے کے لیے وقف کر دی۔

ان کی شاعری جذبۂ حریت سے لبریز تھی:

ہم بولیں تو فسانہ کہا جائے

وہ ماریں تو زمانہ کہا جائے

یہ اشعار ان کے اس جذبے کی جھلک ہیں جو انہوں نے زمیندار میں ہر صفحے پر بکھیر دی تھی۔

زمیندار کے اثرات قوم میں بیداری، دشمن میں کھلبلی:

"زمیندار" ایک ایسا صحافتی کارنامہ تھا جس نے مسلمانوں کو ان کی شناخت اور طاقت کا احساس دلایا۔ انگریز حکومت کی استحصالی پالیسیوں کو بے نقاب کیا۔ خلافت تحریک میں زمیندار کی تحریریں مسلمانون کے جذبات کو مہمیز دیتی رہیں، شدھی تحریک کے مقابلے میں اسلام کے دفاع میں کھل کر آواز بلند کی اردو زبان، تہذیب اور مسلم کلچر کے تحفظ کو اپنا دینی فریضہ سمجھا؛ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زمیندار صرف اخبار نہ تھا بلکہ قومی شعور کا آئینہ تھا۔

حکومت کی دشمنی، جب کاغذ سے خطرہ محسوس ہو:

انگریز حکومت نے بارہا زمیندار پر پابندیاں لگائیں، مولانا کو گرفتار کیا گیا، جرمانے اور مقدمات کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے کبھی جھکنا نہ سیکھا۔ زمیندار پر کئی بار ضبطی ہوئی، اشاعت روک دی گئی لیکن مولانا کا قلم کبھی رکا نہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب انگریز کی نظر میں قلم بندوق سے زیادہ خطرناک ہو چکا تھا اور اس خطرے کا نام تھا ظفر علی خان۔

صحافت کے دینی و قومی پہلو:

مولانا ظفر علی خان نے زمیندار کے ذریعے صحافت کو ایک نئی پہچان دی:

۱۔ اسلامی غیرت کا پرچار:

زمیندار میں ہر تحریر مسلمانوں کو ان کے ایمان، غیرت اور تاریخ کی یاد دلاتی۔ انگریز کی غلامی کو وہ کفر کی زنجیر سمجھتے اور امت کو اس سے نکالنے کا فریضہ اپنا دینی فرض سمجھتے۔

۲۔ قوم پرستی نہیں ملت پرستی:

مولانا ظفر علی خان نے کبھی اندھی قوم پرستی کا پرچار نہ کیا بلکہ ملت اسلامیہ کو ایک اکائی مانا اور اسی شعور کی تشکیل کی کوشش کی۔

۳۔صحافت بطور جہاد:

زمیندار کے ہر اداریے میں، ہر نظم میں، ہر فقرے میں ایک للکار ہوتی تھی۔ یہ للکار صرف سیاسی نہیں بلکہ ایمانی بھی ہوتی۔ ان کے یہاں صحافت فقط "اطلاع" نہیں بلکہ دعوت، اصلاح اور مزاحمت تھی۔

اردو زبان اور ادب کی خدمت:

مولانا ظفر علی خان نے اردو صحافت کو زبان و بیان کا ایسا ذائقہ دیا کہ آج بھی زمیندار کی پرانی فائلیں ادب کا خزانہ مانی جاتی ہیں۔ان کی زبان میں قرآنی اسلوب کی جھلک، فارسی تراکیب کی چمک، عوامی زبان کی سادگی، انقلابی شاعری کی تپش سب کچھ موجود تھا۔انہوں نے اردو کو صحافت کی زبان سے نکال کر جدوجہد کی زبان بنا دیا۔

اردو صحافت پر انگریزوں کی پابندیاں:

برطانوی استعمار نے جہاں برصغیر کے عوام پر عسکری، سیاسی اور اقتصادی جبر کے پہاڑ توڑے، وہیں فکری اور صحافتی میدان کو بھی قابو میں رکھنے کے لیے طرح طرح کی قانونی، انتظامی اور نفسیاتی تدابیر اختیار کیں۔ اردو صحافت جو برطانوی سامراج کے خلاف ایک توانا اور بیدار مغز آواز بن کر ابھری تھی، بہت جلد استعمار کے نشانے پر آ گئی۔ اس کی تحریروں میں جو مزاحمتی قوت، قومی غیرت اور بیداری کی لہر تھی، وہ حکومتِ برطانیہ کے لیے ناقابلِ برداشت بن گئی۔ چنانچہ ایک بھرپور اور منصوبہ بند حکمتِ عملی کے تحت اردو صحافت کو دبانے، خاموش کرانے اور اس کی آواز کو سنسر کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

پریس ایکٹ 1835، 1878 اور دیگر قوانین:

برطانوی حکومت نے آزادی اظہار پر قدغن لگانے کے لیے باقاعدہ قانونی ڈھانچہ تیار کیا۔ پریس ایکٹ 1835 جو لارڈ میکالے کی ذہنی اختراع تھا، اس کا مقصد ظاہری طور پر آزادی صحافت دینا تھا مگر عملاً یہ صحافت کو قابو میں رکھنے کا ایک نفیس ہتھکنڈہ ثابت ہوا۔

بعد ازاں پریس اینڈ رجسٹریشن آف بکس ایکٹ 1867 اور پھر خصوصاً ورنامنٹ ایکٹ 1878 کے نفاذ کے بعد تو گویا صحافت پر قفل ڈال دیا گیا۔ ورنامنٹ ایکٹ نے حکومت کو اختیار دیا کہ وہ کسی بھی اخبار کو بغیر مقدمہ چلائے بند کر سکتی ہے۔ اس قانون کے ذریعے متعدد اردو اخبارات کو بند کیا گیا اور صحافیوں کو مجرموں کی طرح عدالتوں میں گھسیٹا گیا۔

1910 میں نافذ ہونے والا پریس ایکٹ اس ظلم و جبر کی انتہا تھی۔ اس قانون کے تحت حکومت کو اختیار مل گیا کہ وہ کسی بھی اخبار پر محض شبہ کی بنیاد پر جُرمانہ عائد کرے، اس کی ضمانت ضبط کرے یا اسے مکمل طور پر بند کر دے۔

گرفتاری، ضبطی، جُرمانے:

انگریز حکومت نے صرف قانون سازی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس پر سختی سے عمل بھی کیا۔ متعدد اخبارات کے ایڈیٹر گرفتار کیے گئے، ان کے دفاتر پر چھاپے مارے گئے، چھاپہ خانے سیل کر دیے گئے اور لاکھوں کی تعداد میں اخباروں کی کاپیاں ضبط کر لی گئیں۔

مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، حسن نظامی جیسے جید صحافیوں کو پابندِ سلاسل کیا گیا، محض اس لیے کہ ان کی تحریروں میں حق گوئی اور عوامی بیداری تھی۔ بعض اخبارات پر لاکھوں روپے کے جُرمانے عائد کیے گئے اور کئی کو اپنی اشاعت بند کرنی پڑی۔

صحافیوں کی قربانیاں:

اردو صحافت سے وابستہ افراد نے محض قلم نہیں اٹھایا بلکہ اپنے ضمیر، زندگی اور مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔ مولوی محمد باقر کی شہادت ہو یا مولانا حسرت موہانی کی قید و بند کی صعوبتیں، مولانا ظفر علی خان کی مسلسل نظر بندی ہو یا مولانا ابوالکلام آزاد کی اشاعت پر بندش یہ سب صحافی دراصل وہ مجاہد تھے جنہوں نے میدانِ جنگ میں نہ سہی مگر خیالات اور الفاظ کی جنگ میں دشمن کے قلعے ہلا دیے۔

یہ قربانیاں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اردو صحافت محض خبروں کی ترسیل کا ذریعہ نہ تھی بلکہ ایک نظریاتی جنگ کا محاذ تھی جہاں لکھنے والا ہر شخص اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سچ بیان کرتا تھا۔

صحافت کا حوصلہ واستقامت:

انگریزوں کے جبر، تشدد اور پابندیوں کے باوجود اردو صحافت نے جس حوصلے، استقامت اور فکری استقلال کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ جیلوں کی کوٹھریاں، ضبط شدہ کالم، منسوخ شدہ پرمٹ اور سنگین نتائج کی دھمکیاں بھی اردو صحافی کو سچ لکھنے سے باز نہ رکھ سکیں۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے اردو صحافت کو عوام کا ترجمان بنایا اور عوام کو حق کی پہچان۔

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر اردو صحافت انگریزوں کے خلاف نہ اٹھتی تو شاید عوامی شعور اور سیاسی بیداری کا وہ طوفان نہ اٹھتا جو تحریک آزادی کی بنیاد بنا۔ اردو صحافت نے اپنی جان کی بازی لگا کر برصغیر کی فضا میں حریت کا نغمہ گایا اور اس کے ہر حرف نے آزادی کی تاریخ رقم کی۔

نتیجہ وسفارشات:

اردو صحافت کی دوسوسالہ تاریخ ایک ایسی داستاں ہے جس میں جدوجہد ہے، ایثار ہے، قربانی ہے اور فکری شعور کی وہ چمک ہے جس نے ایک قوم کی تقدیر کا رخ بدل دیا۔ اس صحافت نے نہ صرف خبروں کو قلم بند کیا بلکہ ایک عہد کی فکری، سیاسی اور تہذیبی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اردو زبان کو وقار بخشنے، عوام میں بیداری پیدا کرنے اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے میں اردو صحافت کا

کردار ناقابلِ فراموش ہے۔

نتیجہ:

اگر اردو صحافت کے پورے سفر پر ایک گہری نظر ڈالی جائے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اس نے صرف الفاظ کی دنیا آباد نہیں کی بلکہ ایک فکری تحریک کی بنیاد رکھی۔

برطانوی استعمار کے خلاف اردو صحافت کی مزاحمت نے عوامی شعور کو نئی جہت دی۔ یہ صحافت ہی تھی جس نے تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، عدم تعاون اور دیگر آزادی کی تحریکات کو عوامی پذیرائی عطا کی۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو صحافت برصغیر کی آزادی کی تحریک کی خاموش مگر پائیدار بنیاد تھی۔ اس نے ایک ایسے طبقے کو پیدا کیا جو نہ صرف حالات کا تجزیہ کرتا تھا بلکہ ان کے خلاف متحرک بھی ہوتا تھا۔ اخبارات کے ذریعے ایک ایسی نسل تیار ہوئی جس نے نہ صرف غلامی کو چیلنج کیا بلکہ آزادی کے خواب کو عملی تعبیر دی۔

اردو صحافت کی انفرادی خوبیاں یہ تھیں:

عوامی مسائل کا بے باک اظہار، نظریاتی وابستگی اور قومی حمیت، مزاحمت، بیداری اور اخلاقی استقامت، سیاسی شعور اور مذہبی حساسیت کا امتزاج، زبان و بیان میں دل کشی، سنجیدگی اور اثر انگیزی تاہم اس شاندار تاریخ کے باوجود اردو صحافت آج کئی چیلنجز سے دو چار ہے۔

سفارشات:

ماضی کی تابناک روایات کو دیکھتے ہوئے موجودہ اور آنے والے صحافیوں، اداروں اور قارئین کو چند سفارشات پر غور کرنا چاہیے تاکہ اردو صحافت کی عظمت باقی رہے اور وہ زمانہ حال میں بھی اسی وقار سے اپنا سفر جاری رکھ سکے:

۱۔ صحافت کو مقصدی بنائیں، تجارتی نہیں:

آج کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ صحافت ایک مقدس فریضہ کے بجائے ایک نفع بخش کاروبار میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اردو صحافت کو پھر سے نظریاتی، تعمیری اور عوامی بنایا جائے تاکہ وہ محض خبروں کی ترسیل نہ ہو بلکہ اصلاح و ارتقاء کا ذریعہ بنے۔

۲۔ تاریخِ صحافت کو نصاب میں شامل کیا جائے:

اردو صحافت کے مجاہدوں کی قربانیوں کو نئی نسل سے متعارف کرانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر طلباء کو ان ناموں سے واقف کرایا جائے جنھوں نے اپنی زندگیاں صحافت پر قربان کیں تو شاید وہ بھی صحافت کو صرف پیشہ نہیں بلکہ مشن سمجھنے لگیں۔

۳۔صحافت میں تحقیق اور تنقید کوفروغ دیا جائے:

موجودہ اردو اخبارات میں تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مضامین کی شدید کمی ہے۔آج کی صحافت میں فوری خبریں تو ہیں مگر گہرائی اور فکری رہنمائی کا فقدان ہے۔صحافت کو محض سطحی رپورٹنگ سے نکال کر فکری تجزیے کی جانب لایا جائے۔

۴۔قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو صحافت کو فعال بنایا جائے۔

اردو وہ زبان ہے جو مختلف قوموں، فرقوں اور طبقات کو جوڑتی ہے۔اردو صحافت کو اس پل کا کردار ادا کرنا چاہیے جو مذہبی، لسانی اور علاقائی تعصّبات کو ختم کر کے ایک ہم آہنگ قوم کی تعمیر کرے۔

۵۔خواتین کی شمولیت کوفروغ دیا جائے:

اردو صحافت میں خواتین کا کردار ابتدا سے رہا ہے مگر اب بھی ان کی تعداد اور حیثیت بہت محدود ہے۔ایک ترقی پسند صحافت کے لیے ضروری ہے کہ خواتین کو ادارتی اور تحقیقی ذمہ داریاں دی جائیں، تاکہ صحافت کی دنیا میں توازن اور جامعیت پیدا ہو۔

۶۔صحافت کو سچائی کا آئینہ بنائیں۔

جدید دور میں سوشل میڈیا کی یلغار اور زرد صحافت نے سچائی کو مسخ کرنا شروع کر دیا ہے۔اردو صحافت کو چاہیے کہ وہ سچائی، دیانت اور اخلاقیات پر اٹل رہے تاکہ اس کا مقام عوام کے دلوں میں محفوظ رہے۔

اختتامیہ:

اگر اردو صحافت اپنے ماضی کی روشنی میں اپنے حال کا جائزہ لے اور مستقبل کے لیے ایک فکرمند، نظریاتی اور دیانت دار لائحہ عمل مرتب کرے تو نہ صرف اس کی بقاممکن ہے بلکہ وہ ایک بار پھر قوم کی رہنمائی کے مقدس منصب پر فائز ہو سکتی ہے۔ایسی صحافت جو زبان کی نزاکت، قوم کی وحدت، دین کی روشنی اور سچائی کی طاقت سے مزین ہو وہی صحافت تاریخ میں زندہ رہتی ہے اور وہی صحافت قوموں کی تقدیر بدلتی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

تحریک آزادی میں اردو صحافت کا حصہ: ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی

اردو صحافت کا سفر: گربچن چندن

اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ: مولوی محبوب عالم

اردو صحافت: مرتب: انور علی دہلوی

اردو صحافت آزادی کے بعد: ڈاکٹر افضل مصباحی

اردو صحافت کا مطالعہ: احمد ابراہیم علوی

فن صحافت: پروفیسر ظہور الدین

کاروان صحافت: ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

اٹھارہ سو ستاون اخبار اور دستاویزیں: عتیق صدیقی

اردو صحافت ماضی اور حال: (مرتبین) خالد محمود، سرور علیدی

اردو صحافت کا منظر نامہ : مرتب: معصوم مرادآبادی

اردو صحافت اور تحریک آزادی: ڈاکٹر سمیع احمد

☆☆☆☆☆

صدر عالم گوہر
پرسولیا، مدھوبنی بہار

نولکھا راج محل

راج نگر بہار کا ایک عجوبہ

میں جب بھی راج نگر جاتا ہوں اور راج محل (جسے لوگ نولکھا کے نام سے جانتے ہیں) کو دیکھتا ہوں تو دشینت کمار کا مذکورہ بالا شعر میرے ہونٹوں پر آجاتا ہے۔ اور حقیقت میں یہ آج کھنڈر ہی تو ہے۔ جسے بنانے میں اس زمانے میں نولاکھ روپے یا نولاکھ چاندی کے سکے خرچ کیے گئے تھے اور تب نولکھا راج محل مکمل ہوا تھا۔ میرا ایک شعر بھی ہے کھنڈروں والا جو نولکھا جانے پر یاد آجاتا ہے۔

گھر کا گھر ویران کب کا ہو چکا اس شہر کا
آپ کیا آئے ہوئے ہیں کھنڈروں کے شہر میں

لیکن میں گاہے گاہے چلا ہی جاتا ہوں کھنڈروں کے اس شہر میں۔ بچپن میں ماں اور ابو کے ساتھ جوانی میں اس نولکھا میں منعقد مختلف پروگراموں میں شرکت کی وجہ سے۔ مدھوبنی ضلع ویسے تو کئی چیزوں کے لیے جانا جاتا ہے جیسے پان، مکھانا، مچھلی، ندی، تالاب، مدھوبنی پینٹنگ اور راج نگر کا راج محل نولکھا۔ راج محل نولکھا سیاحوں کا پسندیدہ مقام و پکنک منانے والوں کا پکنک اسپاٹ یا جنت ہے یہاں قرب و جوار کے لوگ سیر و تفریح کے لئے بھی آتے ہیں۔

بچپن میں جب راج محل نولکھا کے کیمپس سے گزرتا تھا تو محل کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیل تھی۔ قلع نما بنایا ہوا تھا بلکہ قلع ہی تھا۔ اب جب کہ مدتوں بعد وہاں جانا ہوا تو دیکھا فصیل ٹوٹ چکی ہے لوگوں نے راج محل کے اندر سے راستہ بنا لیا ہے۔ راج محل کا یہ حال دیکھ کر ایک شعر یاد آ گیا۔

دیوار کیا گری میرے کچے مکان کی
یاروں نے میری صحن سے رستے بنا لیے

جس راج محل میں لوگ پیدل بغیر اجازت داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک خوف لوگوں کے دلوں میں رہتا تھا۔ وہاں اب لوگ پیدل سائیکل موٹر سائیکل اور فور ویلر سے بے روک ٹوک بے خوف وخطر آتے جاتے ہیں۔ یہ راج محل جسے راج پیلیس بھی کہا جاتا ہے لیکن عرف عام میں نولکھا کے نام سے لوگ جانتے ہیں۔ اب حکومت ہندوستان کی ملکیت ہے۔ اس کے کچھ حصے میں بورڈر سیکورٹی فورس کے افسران اور سپاہی رہتے ہیں اور آگے کا جو حصہ ہے جس میں عمارتیں کچھ صحیح سلامت ہیں۔ اس میں ایک کالج قائم کر دیا گیا ہے۔ اس کالج کا نام وشویشور سنگھ جنتا مہاودیالیہ ہے۔ ابھی کچھ برسوں پہلے اس راج محل نولکھا میں ایک شاندار سہ روزہ پروگرام کا

انعقاد کیا گیا تھا۔جس کے لیے نولکھا کے کچھ حصے جو ابھی خالی ہیں۔ان حصوں کو خوب سجانے اور صاف صفائی کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ ایک بہت بڑا پروگرام بہت بڑے پیمانے پر کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس کے اسپانسروں کے نام مجھے اس لیے یاد ہیں کہ مجھے جو تحائف اس پروگرام میں شرکت کرنے پر اعجاز کے طور پر دیے گئے تھے ان میں ایک کافی مگ بھی ہے۔جس پر ان سارے اسپانسر کے نام اشتہار کے طور پر درج ہیں۔اسی میں سے دیکھ کر وہ نام رقم کر رہا ہوں۔

ساہتیہ اکاڈمی دہلی، اندرا گاندھی نیشنل سینٹر فار آرٹس، سینٹر فار اسٹڈیز آف ٹریڈیشنل اینڈ سسٹمز (CSTS) 150 ایرز اف سلیبر یٹنگ دی مہاتما گاندھی اسمرتی اینڈ درش سمیتی نئی دہلی، مدھوبنی لٹریچر فیسٹیول۔

اس پروگرام کا نام تھا مدھوبنی لٹریچر فیسٹیول اس سہ روزہ پروگرام کے دو سیشن میں مجھے حصہ لینے کا موقع ملا۔ایک پروگرام میں بطور شاعر اور ایک ڈسکشن کے سیشن میں؛ جس کی وجہ سے راج محل نولکھا کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ایک مرتبہ اور نولکھا محل میں جانے کا موقع ملا۔اس بار اس محل میں واقع کالج "وشویشور سنگھ جنتا مہاودیالیہ" میں منعقد شب افسانہ پروگرام میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اس موقع پر نولکھا راج محل کا وہ حصہ جو مقفل رہتا ہے اور کالج کے لئے وقف ہے اس حصے کو دیکھنے کا موقع ملا۔

دارا رہا نہ جم نہ سکندر رسا بادشاہ
تخت زمیں پہ سینکڑوں آئے چلے گئے

راج نگر جس کے لیے مشہور ہے وہ ہے یہاں کا دربھنگہ مہاراج کا بنوایا ہوا راج محل یا راج پیلیس جسے عرف عام میں لوگ نولکھا کہتے ہیں اور نولکھا کے نام سے یہ جانا جاتا ہے۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ اس راج محل کو بنانے میں نو لاکھ روپے لگے ہوں گے۔اس لیے اس راج محل کا نام نولکھا ہے۔مگر بعد کی تحقیق سے پتہ چلا کہ نولکھا کیمپس جس میں مندر تالاب عمارتیں ہی وہ سب دربھنگہ مہاراج کے ایک انگریز قرضدار نے بنایا تھا۔اس کا نام ایم۔ایس۔کورنی تھا۔کورنی ایک اچھا اور معروف آرکیٹیکٹ تھا۔جب وہ انگریز کورنی دربھنگہ مہاراج کا قرض ادا نہیں کر سکا تو قرض کے عوض اس نے دربھنگہ کے راجہ مہاراج لکشمیشور سنگھ کے لیے راج نگر میں ایک ایسے راج محل کی تعمیر کا وعدہ کیا کہ جس کا مضبوطی میں ثانی نہیں ہوگا۔اس نے کہا کہ وہ ایک ایسا محل راجہ کے لیے بنا دے گا جو کبھی ٹوٹے گا نہیں۔کورنی نے پہلی دفعہ ہندوستان میں سیمنٹ کو متعارف کرایا۔کورنی نے دربھنگہ مہاراج سے کہا کہ وہ محل کی تعمیر میں ایک ایسے سامان کا استعمال کرے گا ایک ایسی چیز کا استعمال کرے گا جس سے اس کا بنایا ہوا وہ محل کبھی برباد نہیں ہوگا۔کبھی ٹوٹے گا نہیں۔مثال کے طور پر اس نے سیمنٹ کا استعمال کر کے ایک ہاتھی بنایا اور اپنے دعوے کا ثبوت دیا کہ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا ہے۔مہاراج کو اس کا بنایا ہوا یہ ہاتھی بہت پسند آیا اور اس کی مضبوطی کو دیکھ کر مہاراج نے کہا کہ اسے توڑا نہ جائے برباد نہ کیا جائے بلکہ اس کو ہی کھمبا بنا کر اس پر عمارت تعمیر کی جائے جو ہاتھی آج بھی راج نگر میں موجود ہے اور راج نگر کے راج پیلیس کو دیکھنے والے سب سے پہلے یہیں آتے ہیں۔ان ہاتھیوں کو دیکھتے ہیں ان ہاتھیوں کے ساتھ اپنی تصویریں کھنچواتے ہیں۔جو ان کے لیے یادگار رہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں پہلی دفعہ سیمنٹ کا استعمال راج نگر کے راج محل کو بنانے میں کیا گیا تھا۔میں نے تو سمجھا تھا کہ اس راج نگر کے راج محل کو بنانے میں نو لاکھ روپے خرچ ہوئے ہوں گے۔جس کی وجہ سے اسے نولکھا کہا جاتا ہے۔لیکن بعد کی تحقیق

سے یہ عقدہ کھلا کی راج محل کو بنانے میں نہیں صرف راج محل کے اندر جو مندر بنوائی گئی ہے کالی مندر اس کو بنانے میں دربھنگہ راج کے مہاراج رامیشور سنگھ نے (جو دربھنگہ مہاراج لکشمیشور سنگھ کے چھوٹے بھائی تھے) نے نو لاکھ چاندی کے سکے خرچ کیے تھے۔

یہ کالی مندر سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے جو بہت ہی خوبصورت ہے، اس کی خوبصورتی آج بھی لوگوں کو متاثر کرتی ہے اور راج محل میں جانے والے کالی مندر ضرور جاتے ہیں۔ اس مندر کے سامنے ایک بہت بڑا گھنٹہ ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ گھنٹہ پہلے پیتل کا تھا لیکن اس کو چور چرا کر لے گئے اور ابھی جو ہے وہ دوسرا اسی سائز کا گھنٹہ ہے جسے بنوا کر لگا دیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ چور جب اس بڑے سے گھنٹے کو اٹھا کر نہیں لے جا سکے تو وہیں سامنے کے تالاب میں پھینک کر چلے گئے۔ حقیقت جو بھی ہو مگر آج بھی اس کالی مندر کے سامنے ایک بہت بڑا گھنٹہ رکھا ہوا ہے۔ جس کو چھونا اور گھنٹہ بجانا منع ہے۔ مگر چونکہ گھنٹے کے پاس کوئی پہریدار نہیں رہتا ہے۔ اس لیے بچے اس کو چھوتے اور کھیلتے ہیں۔ یہ کالی مندر چاندنی رات میں تو اور بھی خوبصورت نظر آتی ہے۔ میں جب بھی اس مندر کو دیکھنے گیا یہاں لوگوں کا ہجوم ہی نظر آیا۔

غرور اور بڑا بول انسان کو زیب نہیں دیتا، اللہ نے بڑے بڑے غرور اور دعوے کرنے والے کا غرور توڑ دیا ہے؛ غرور ٹائٹینک بنانے والوں کو بھی بہت تھا اور اپنے کام پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ تھا۔ اس نے بھی دعوی کیا تھا کہ میں نے ایسا جہاز بنایا ہے اور ایسی ایسی تکنیک اپنائی ہے کہ یہ جہاز پانی میں کبھی نہیں ڈوبے گا لیکن اللہ کو اس کا دعوی اور غرور پسند نہیں آیا اور اس کا جہاز جس کا دعوی اس نے کیا تھا کہ کبھی نہیں ڈوبے گا، وہ جہاز اپنے پہلے سفر میں ہی سمندر میں غرقاب ہو گیا سمندر کی نذر ہو گیا۔ کچھ ایسا ہی ایم۔ ایس۔ کورنی کے دعوے کا بھی حشر ہوا، اس راج محل کی حصار بندی کے بعد 1934 عیسوی میں بہار اور نیپال میں ایک ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ اس سے پہلے کبھی ایسا زلزلہ لوگوں نے نہیں دیکھا تھا، ہندوستان کی تاریخ میں بہار کے 1934 عیسوی کے زلزلے کا ذکر موجود ہے، ایسا زبردست زلزلہ آیا کہ پورا راج محل ہی نہیں سارا بسا بسایا ہوا شہر تہس نہس ہو گیا اور ایم۔ ایس۔ کورنی کا بنایا ہوا راج محل اور اس کا دعوی بھی اسی کی نذر ہو گیا، اس زلزلے میں راج محل اس بری طرح برباد ہوا کہ جس کا کہنا مشکل ہے؛ اس کے بعد پھر اس راج محل کی مرمت نہیں ہوئی، راج محل کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا مگر کورنی کا بنایا ہوا ہاتھی آج بھی برقرار ہے اور عوام کی تفریح کا سامان بنا ہوا ہے۔

راج نگر کا نولکھا محل ایک اور تاریخی وجہ سے جانا جاتا ہے کیونکہ راج نگر متھلا میں ہے جہاں کی زبان میتھلی ہے اور اسی میتھلی زبان میں پہلی بار ایک میتھلی فلم بنانے کا منصوبہ راج نگر کے مرزا پور کے مہنت مدن موہن داس نے بنایا تھا اور ان کے اس منصوبے میں شریک تھے ان کے جگری دوست کیدار ناتھ چودھری۔ اس فلم کے پارٹنر اور کرتا دھرتا تھے کیدار ناتھ چودھری جو بعد میں ایک ادیب کے طور پر مشہور ہوئے اور کئی ناول لکھے۔ جس میں سے ایک سوانحی ناول بھی ہے۔ جس میں اس میتھلی فلم کے بننے کے دوران کیا کیا مسائل آئے اس کا ذکر ہے۔ اس فلم کا نام تھا "ممتا گابے گیت"۔ اس فلم کی ہیروئن مسلمان گجراتی اداکارہ عذرا تھی۔ چونکہ پہلی دفعہ میتھلی زبان کی کوئی فلم بن رہی تھی جس کے لیے سارے اداکار اور فلم سے متعلق تمام عملہ ممبئی سے پٹنہ ہوتے ہوئے راج نگر آئے تھے اور اسی راج نگر کے راج پیلس میں اس فلم کی شوٹنگ دو مہینے تیرہ دن تک ہوئی تھی۔ راج نگر کے راج پیلیس میں سارا سیٹ لگایا گیا تھا اور ساری شوٹنگ یہیں ہوئی تھی۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ عذرا گجراتی زبان جانتی تھی اس لیے عذرا کو میتھلی زبان میں اپنا ڈائیلاگ بولنے کی ٹریننگ دی گئی

تھی ،اس فلم کے گیت اس وقت میں تومشہور ہوئے ہی تھے اب بھی اس فلم کے گیت لوگوں کی زبان پر ہیں جیسے۔

بھرنگری میں شور ہوا امی تو ہر گور ماما چان سن ۔گلوکارہ سمن کلیان پور؛ گیت کار روندر ناتھ ٹھاکر

مدھو بنی ضلع کا راج نگر جو پہلے دربھنگہ ضلع میں ہی پڑتا تھا، جب دربھنگہ کئی ضلعوں میں منقسم ہوا تو اس میں سے ایک ضلع مدھو بنی بھی وجود میں آیا۔ دربھنگہ کے راجا کی خواہش تھی کہ راج نگر کو متھلا کا دارالسلطنت بنایا جائے اور یہیں سے سارے متھلا پر حکومت کی جائے اسی لئے بطور خاص راج نگر کو بسایا گیا، اس کی وجہ یہ تھی کی یہاں زمین کی کوئی کمی نہیں تھی، خالی زمین ہونے کی وجہ سے یہ سہولت رہتی ہے کہ شہر کو اپنی ضرورت اور اپنی مرضی کے حساب سے بسایا جا سکتا ہے؛ راج نگر کے معنی ہوتے ہیں راجا کا نگر یا راجا کا شہر مگر ایسا ہو نہ سکا اور راج نگر دارالسلطنت ہوتے ہوتے رہ گیا۔

دربھنگہ کے راجا یعنی دربھنگہ مہاراج کا تعلق مغلیہ سلطنت سے بھی رہاہ۔ کیونکہ دربھنگہ کے راجا کو اکبر بادشاہ نے متھلا پر حکومت کرنے کا اختیار دیا تھا اور متھلا کا رقبہ یا چوہدی اس طرح کتابوں میں درج ہے: مغرب میں گنڈک ندی، مشرق میں کوسی ندی، شمال میں کوہ ہمالیہ اور جنوب میں گنگا ندی؛ راجہ دربھنگہ کے یہاں مغلیہ سلطنت کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر کے پوتے شہزادہ مرزا محمد رئیس بخت زبیرالدین گورگان تشریف لائے تھے اور مہاراج لچھمیشر سنگھ بہادر والی ریاست دربھنگہ کی فرمائش پر ایک کتاب لکھی تھی جس میں ان کا سفر نامہ ہے اور دربھنگہ کے شاہی خاندان کا ذکر ہے۔ اس کتاب کے سرورق پر کتاب کا نام "موج سلطانی" لکھا ہے۔

نولکھا محل جسے دربھنگہ کے راجہ (جسے لوگ عزت سے دربھنگہ مہاراج کہتے ہیں) نے بنوایا تھا، دربھنگہ ایک ریاست تھی مغلوں کے دور حکومت میں؛ مغل حکومت کے سب سے زیادہ شہرت وعزت پانے والے شہنشاہ جلال الدین اکبر (جنھیں اکبر دی گریٹ کہا جاتا ہے) نے دربھنگہ کو ایک ریاست منظور کر کے دربھنگہ کے مہاراج کو دیا تھا۔ میں نے میتھلی میں میتھل شاعر ودیا پتی دربھنگہ کے راجہ اور شہنشاہ اکبر کے تعلق سے، بہت سی باتیں پڑھی تھیں جس میں یہ بھی پڑھا تھا کہ ایک بار دربھنگہ ریاست کے راجہ کو جنگ میں شکست ہوئی اور ان کو قید کر کے شہنشاہ اکبر کے دربار میں لے جایا گیا جہاں سے میتھل کوی ودیا پتی نے اپنی شاعری کے بدولت راجا کو چھڑا کر اور دربھنگہ کی ریاست واپس دلوا کر دربھنگہ لائے تھے جس میں شہنشاہ اکبر نے متھلا ریاست کی چوہدی (سرحد) یوں لکھ کر دی تھی: مشرق میں کوسی ندی، مغرب میں باگمتی ندی، جنوب میں گنگا ندی اور شمال میں ہمالیہ پہاڑ (از گنگ تا سنگ) لیکن مجھے ان باتوں پر اعتبار کم ہی تھا۔ مگر جب معلوم ہوا کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ کے پوتے دربھنگہ مہاراج کے مہمان ہوئے تھے اور انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی تو میرے دل میں یہ جستجو پیدا ہوئی کہ میں اس کتاب کو دیکھتا۔ اتفاق سے دربھنگہ مہاراج کے آخری راجہ مہاراج کامیشور سنگھ کی یوم پیدائش ہر سال منائی جاتی ہے جس میں دربھنگہ مدھو بنی پٹنہ دلی اور ملک بھر سے گنے چنے لوگوں کو مدعو کیا جاتا ہے اور ایک شاندار جشن کا انعقاد ہوتا ہے؛ میری خوش قسمتی کہ مجھے بھی اس جشن کا دعوت نامہ رجسٹری ڈاک سے آتا ہے اور میں اگر بہار میں رہا تو ضرور اس جشن میں شریک ہوتا ہوں، اتفاق سے ایک بار جب میں اس جشن میں شرکت کی غرض سے گیا تو اس پروگرام میں کچھ کتابیں جو مہاراج کامیشور سنگھ کی رانی نے جو ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا نام "کلیانی فاؤنڈیشن" ہے۔ اس کے تحت ایک ضخیم کتب خانہ

ہے جس میں جا کر میں بھی استفادہ کرتا رہتا ہوں ۔اسی کے تحت قدیم کتب کی از سر نو بڑے تزک واحتشام سے دوبارہ اشاعت ہوتی ہے اور اسی موقع پر ان کتب کی نمائش اور فروخت کی جاتی ہے ۔ میں جب گیا تو پروگرام کے بعد ان کتب کی نمائش میں گیا وہاں میں نے وہی کتاب دیکھی جسے مغل شہزادے زبیرالدین بہادر گورگان کی تصنیف کردہ کتاب "موج سلطانی" ہے، کتاب دیکھتے ہی مجھے یک گونہ مسرت کا احساس ہوا اور میں نے فوراوہ کتاب جس کی قیمت چارسو پچاس روپے تھی خریدلی گو کہ یہ کتاب دیوناگری (ہندی) میں ترجمہ شدہ ہے لیکن اس کے سرورق کو برقرار رکھا گیا ہے اور ہندی میں بھی کتاب کا نام تحریر ہے، اس کتاب کے سرورق پر کچھ اس طرح تحریر ہے: نام موج سلطانی جلی حروف میں تحریر ہے اور اس کے نیچے یہ تحریر درج ہے۔

موج سلطانی جس کو نہایت عرق ریزی اور کوشش سے جناب شاہزادہ والا تبار سموالکان مرزا محمد رئیس بخت زبیرالدین گورگان دام اقبالہ نے تصنیف فرمایا بحسب ارشاد رئیس نامدار نو آئین بلند اقتدار ملک جناب مہاراج لچھمیشر سنگھ بہادر والی ریاست دربھنگہ دام قبالہ مطبع نامی منشی نول کشور مین بمصقل انطباع متجلی ہوا۔

اسی کتاب یعنی موج سلطانی میں شہزادہ گورگان نے یہ بھی تحریر کیا ہے راجہ پیش ٹھاکر صاحب میتھل برہمن پسر رام چندر ٹھاکر شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانے میں دہلی سرکار سے حکومت دربھنگہ کے راجاؤں میں علم دوست راجا بھی ہوئے ہیں۔جن میں دو راجاؤں کا نام سرفہرست ہے، ایک تھے مہاراج سر رامیشور سنگھ اور دوسرے کا نام تھا مہاراج کامیشور سنگھ؛ یہ دونوں مہاراج تعلیمی اداروں کے قیام اور ترقی میں تعاون کیا کرتے تھے۔ایک طرف جہاں انھوں نے بنارس ہندو یونیورسیٹی کو امداد دی وہیں سرسید احمد کے خواب کی تعبیر علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کو بھی ایک خطیر رقم سے امداد کی جس کا ذکر علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کے دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے۔

مہاراجہ سر رامیشور سنگھ جب علی گڑھ پہنچے تو انھوں نے علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو بیس ہزار روپیئے عطیہ دیا تھا، یہ 1912ء کی بات ہے۔اس بات کا تذکرہ ایس کے بھٹنا گر اپنی کتاب ہسٹری آف دی ایم اے او کالج علی گڑھ میں صفحہ نمبر 318 پر لکھتے ہیں۔

جون 1912 کو صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی استقبالیہ تقریر کے بعد مہاراجہ نے نواب وقار الملک کو بیس ہزار روپے کا ایک چیک پیش کیا جو اب تک کالج میں کسی غیر مسلم کی سب سے بڑی مدد تھی۔

اس کے علاوہ 1945 میں دربھنگہ مہاراج کامیشور سنگھ (1907-1962) نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج کے لیے پچاس ہزار روپیے کی مدد کی، اس کی جانکاری خلیق احمد نظامی کے ذریعہ مرتب کتاب ہسٹری آف دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (1920-1945) میں بھی ملتی ہے۔واضح ہو کہ کامیشور سنگھ دربھنگہ مہاراج سر رامیشور سنگھ کے بیٹے تھے۔

نولکھا بنانے والے دربھنگہ مہاراج اور ان کے اہل خانہ کی علم دوستی کی ایک اور مثال ہمارے سامنے دربھنگہ کے للت نارائن متھلا یونیورسیٹی کے کیمپس میں بنی نادر ونایاب کتابوں کی لائبریری ہے جو مہاراجہ کامیشور سنگھ کی بیوہ کے زیر سایہ جاری ہے؛ اسے ایک فاؤنڈیشن کے ذریعے چلایا جاتا ہے جس کا نام ہے "مہارانی کلیانی فاؤنڈیشن"، اسی فاؤنڈیشن کے ذریعے ہر سال ۲۸ نومبر کو مہاراجہ کامیشور سنگھ کے یوم پیدائش پر ایک یادگاری جلسہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں ملک بھر سے شاعر ادیب اور نامور ہستیاں شامل ہوتی ہیں اور مہاراجہ کامیشور سنگھ کو یاد کیا جاتا ہے۔

مولاناابوالکلام آزاد کی شاعری: ایک جھلک

ڈاکٹرعبدالغنی (اسسٹنٹ پروفیسر)
صدر شعبہ اردو جے۔این۔کالج مدھوبنی بہار
موبائل نمبر-9525732786

بہ فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کشور دامن دل می کشد کہ جاں ایں جاست

اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ مولانا آزاد کی شخصیت ہشت پہل اور مختلف النوع ہے۔ نہ صرف ہندوستانی تاریخ بلکہ عالمی تاریخ بھی اس طرح کی شخصیت پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس طرح کی شخصیت عالمی افق پر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اُن کی شخصیت مختلف شعبہ حیات پر محتوی ہے۔ مثلاً سیاست مذہب ادب صحافت اور شاعری وغیرہ۔ آزاد کی شخصیت کا نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کی روش خیالی جدت طرازی تقلید سے انحراف اور اجتہاد سے مناسبت رکھنے والا مزاج ہمیشہ اس امر کا متقاضی تھا کہ طبقہ علماء موجودہ حالات پر از سر نو نظر ڈالیں۔ نئے تقاضوں کو جاننے اور اسلام کی دعوت کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایسی روش اختیار کریں جو فہم وادراک سے مناسبت رکھتا ہو پسندیدہ اور قابل قبول ہو تب ہی وہ بحسن خوبی اپنے فرائض سے سبک دوش ہو سکتے ہیں۔ لیکن مولانا کا یہ خواب قابل تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کے باوجود کہ علماء نے ان باتوں کو سمجھا بھی اور صداقت کو تسلیم بھی کیا لیکن ان امور پر اُن کی خاطر خواہ توجہ نہ ہو سکی جناب ضیاء الحسن فاروقی کے مطابق:

مولانا کے دل پر یہ داغ بہت گہرا تھا اور اسے وہ اپنے ساتھ دنیا سے لے گئے۔ ("افکار آزاد" ضیاء الحسن فاروقی۔ ص 25)

مولانا آزاد نے آنکھ کھولتے ہی ہندوستانی مسلمانوں کو سرسید اور علی گڑھ کے افکار وخیالات کے زیر اثر پایا۔ اب مولانا کی یہ پریشانی تھی کہ سرسید ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح واصلاح تو چاہتے تھے لیکن انگریزی حکومت کے ساتھ ملکر جب کہ مولانا آزاد بھی ہندوستانی مسلمانوں کا بھلا چاہتے تھے لیکن انگریزی حکومت کے برعکس چل کر سرسید انگریزوں سے وفاداری کا اعلان کرکے اپنے ہم وطنوں سے دور ہوتے جا رہے تھے جو مولانا کی نظر میں مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے سراسر نقصان وخسارہ تھا۔ لہٰذا مولانا نے سرسید کے مروجہ موقف کے برعکس جدوجہد کا آغاز کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کو متوجہ کیا کہ وہ اپنے ہم وطنوں سے کٹ کر نہ

رہیں اور آزادی کی لڑائی کے لئے میدان عمل میں آ کر انگریزوں کے خلاف نبرد آزماں ہوں۔

مولانا آزاد کے متعلق پہلے ہی لکھا جا چکا ہے کہ انکی شخصیت ہشت پہل تھی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام پہلوؤں کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں نہ صرف یہ کہ دشوار ہے بلکہ ناممکن ہے، لہذا یہاں انکے شعری کارناموں پر بات کرنا ناگزیر ہے۔ جیسا کہ ہمارے اس مقالے کا موضوع ہے۔ قبل اس کے کہ ان کی شاعری پر خامہ فرسائی کی جائے ضروری ہے کہ کچھ باتیں ان کی صحافت اور ادبی نثر کے حوالے سے کی جائیں کیونکہ اس کے بغیر ان کی شخصیت کو اجاگر نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلہ میں ہم پاتے ہیں کہ مولانا آزاد نے ادبی نثر کے نشوونما میں بھی کچھ کم کارہائے نمایاں انجام نہیں دیے۔ ادبی نثر میں مولانا کا موضوع انشائیہ سے متعلق ہے۔

اردو انسائکلو پیڈیا آف اسلام میں انشائیہ کے معنی کسی ایک دستاویز کا تیار کرنا ہے جسے رئیس دفتر معائنہ کے بعد آخری شکل دے دے۔ "انشاء" سے مراد دستاویز نویسی بھی ہے۔ یعنی خطوط اور دستاویز کی تحریر کا فن ہندوستان میں ہر تعلیم یافتہ ہندوستانی کو خصوصاً اردو کے معلم کو منشی کہا گیا ہے۔ جیسا کہ "مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے" مرتبہ خلیق انجم کے ص۔348 پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں پروفیسر رضی الدین کچھ یوں رقم طراز ہیں: اردو میں انشائیہ نثر کی وہ ہیئت ہے جو مقالوں یا مستقل اصناف کی پابندیوں سے آزاد ہو مثلاً ناول ڈرامہ سوانح عمری مقالات تفاسیر وغیرہ لیکن مکاتیب مستقل صنف ہونے کے باوجود انشائیے میں شمار کیے گئے ہیں۔

انشائیات اصلاً واساساً عمومی ادب ہے لیکن یہ نثر کا باغ نہیں صرف باغیچہ ہے۔ یہ نثر کا دریا نہیں محض جوئے کم آب ہے۔ یہ حقائق کی مکمل تصویر نہیں بلکہ مکمل تصویروں کے وہ خاکے ہیں جو انشاء نگار کی شخصیت نے پیش کئے ہیں۔ (مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے۔ ص۔338)

مولانا ابوالکلام آزاد کی انشائیات میں ایک جزو ان کی خطابت کا بھی ہے یہ واقع ہے کہ ابوالکلام آزاد نہ صرف اپنے وقت کے بلکہ اردو خطابت کے ہر عہد کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ اردو خطابت کی ساری تاریخ میں اُن کا نام سب سے محترم اور سب سے معتبر ہے۔ ابوالکلام آزاد کی نثر موضوع اور مواد کے لحاظ سے علمی نثر ہے۔ علمی نثر منظم فکر کے بغیر ممکن نہیں۔ ابوالکلام کے یہاں علم شک کا نام نہیں یقین کا عرفاں ہے اس میں جان اور جلال ہے اور ساتھ ہی ساتھ جمال اور جذبات کی پُرسکون لہریں بھی ہیں۔ (مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے۔ ص۔355)

جہاں تک مولانا آزاد کی صحافت کا تعلق ہے تو مولانا آزاد کو "جامع صفات" کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے۔ اسی جامعیت میں یہ صفت بھی شامل ہے کہ وہ بہ یک وقت ادیب بھی تھے اور صحافی بھی جن کا کمال یہ ہے کہ صحافت کے عوامی تقاضوں نے ادبی حیثیت پر ذرا بھی اثر نہیں ڈالا اور ادب کے عوامی مطالبوں نے صحافت کو متاثر نہیں ہونے دیا؛ جہاں ان کے صحافت کی زندہ مثال "الہلال" اور "البلاغ" ہے وہاں اُن کے ادب عالیہ کی مثال اُن کی تصنیف "غبار خاطر" اور "غبار خیال" ہے۔

ان کے نثر کی شگفتگی اور برجستگی کی پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ Style is the man کے مصداق تھے۔ ان کے بہت سے صحافتی مضامین بھی ادب پارہ ہیں۔ جو ہمارے اردو ادب کا گراں مایہ حصہ ہیں یہی سبب ہے کہ اردو میں جو اسالیب نثر ہیں ان میں مولانا آزاد کا اسلوب سب سے منفرد ہے۔ بایں وجہ مولانا حسرت موہانی یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں وہ مزہ نہ رہا

اتنا ہی نہیں سجاد انصاری نے تو یہاں تک عقیدت کا مظاہرہ کیا کہ انہوں نے اپنی کتاب "محشر خیال" میں لکھا:

میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو یا مولانا ابوالکلام کی نثر اُسکے لئے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم ؛میرے نزدیک اقبال اور ابوالکلام حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں۔

جہاں تک مولانا آزاد کی شاعری کا تعلق ہے تو قبل اس کے کہ ان کے کلام پر کلام کیا جائے ہم ان کے کلام پر خود ان کے ہی کلام کو پیش کرتے ہیں وہ خود لکھتے ہیں:۔

گیارہ بارہ سال کی عمر میں میں نے جو شعر کہے تھے یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں لیکن اُس وقت انہیں لغویات نے لوگون کو متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی جب کے 36 برس گزر چکے ہیں اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں جو مجھے اس وقت محسوس ہوئی تھی جب "ارمغان فرخ" میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام رسالے میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔ (مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے ص۔470)

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی اپنے مضمون "محب جمال ابوالکلام آزاد" میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور ادبی فن کا جائزہ لیں تو پتا چلے گا کہ وہ ایک ایسا بے کنار سمندر ہے جن کی آغوش میں معلوم نہیں کہ کتنے دریاؤں نے روانی سیکھی ؛ادب، سیاست، مذہب، سماجیات، تنقید یہ سب اسکے سمندر کی لہریں ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان سب موضوعات میں اُن کا مخصوص انداز نگارش نمایاں ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے جمالیاتی حس کی پرواز اس قدر بلند ہے کہ اس کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ حسن یا جمال اُردو شاعری کا مقبول و معروف موضوع رہا ہے۔ ہمارے شعراء نے حسب تخیل و تصور سے اپنے اپنے طور پر اس کی معرفت کا احساس دلایا ہے۔ علامہ اقبال گویا ہیں۔

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اسکی
وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جسکی

اور ڈاکٹر ساقی کچھ یوں گویا ہوتے ہیں۔

کہیں حسن ہے نہ جمال ہے یہ شباب کا سب کمال ہے
جو انتہائے عروج ہے وہی ابتدائے زوال ہے

اور مولانا آزاد کا موقف کچھ یوں ہے:۔

"حسن آواز میں ہو یا چہرے میں تاج محل میں ہوں یا نشاط باغ میں حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محروم ازلی پر جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو"۔ (مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے، ص۔472)

مولانا کے مطابق زندگی میں بہت سی کہانیاں بنائیں خود زندگی ایسے گزری جیسے ایک کہانی ہو۔

ہے آج جو سرگزشت اپنی
لکھتے ہیں کل اُس کی کہانیاں بنیں گی

پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنے مضمون "مولانا آزاد کا شعری ذوق" میں مولانا کے ایک خط کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

1900 یا 1901ء کی بات ہے کہ بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو "پنچ بہادر" نکالا کرتے تھے ایک گل دستہ "ارمغان فرخ" کے نام سے نکالا اور کلکتے میں بعض شعراء اس کی ماہواری طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے ایک مرتبہ اس کی طرح تھی۔

پوچھی زمیں کی تو کہی آسمان کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی تین شعر اب تک ذہن نے ضائع نہیں کئے۔

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی — نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی
گنبد ہے گرد باد تو ہے شامیانہ گرد — شرمندہ میری قبر نہیں پاسبان کی
آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ — پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

یہ ان کا بارہ تیرہ برس کی عمر کا کلام ہے اور وہ بھی 1900 یا 1901ء میں کہا ہوا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اپنے اس مضمون میں مولانا کے ایک شعر کا ذکر کچھ اس انداز میں کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس شعر کا ذکر اکثر مصنفین نے اپنے اپنے مقالات میں بغیر حوالے کے کیا ہے۔ میں یہ شعر اور واقعہ مولانا آزاد کے لفظوں ہی میں بیان کر رہا ہوں جس سے مولانا کی صلاحیت شعر گوئی پر نہیں بلکہ صلاحیت شعر فہمی پر روشنی پڑتی ہے کیونکہ میرے نزدیک شعر گوئی سے شعر فہمی زیادہ مشکل کام ہے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:-

اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خان شوخ رامپوری کلکتے میں مقیم تھے، انہیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیر ہوگئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دکان پر لے گئے جس کی دکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے چند شعر اسی وقت کہہ دو! میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے زمین بتلائی "یاد نہ ہو شاد نہ ہو"۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر لکھ دئے، کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہئے؛ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا:

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، اُن کو کبھی یاد نہ ہو

"کہنے لگے کہ صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحب زادے معلوم ہوتے ہو لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی"۔ (مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور کارنامے، ص۔483)

سیدہ شان معراج اپنے مضمون "ابوالکلام آزاد بحیثیت شاعر" میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:-

مولانا ابوالکلام آزاد کی شعر گوئی اگر صیغہ راز میں رہتی اور محققین آزاد کے صحافت و سیاست کے صحرا میں سے ان کی شاعری

کے گل و یاسمین کو تلاش کر کے قدردان آزاد کے سامنے گل دستے کی شکل میں پیش نہ بھی کیا ہوتا تب بھی مولانا آزاد کی شاعرانہ صحافت اور سحر طراز خطابت کے بین السطور اُن کے شاعرانہ ذہن اور شاعری سے ان کی فطری دل چسپی کی تلاش کوئی مشکل امر نہ تھا۔تحریر اور تقریر میں برمحل فارسی و اردو اشعار کا استعمال موسیقی سے شغف ہر ذی شعور محقق کو انھیں شاعر ماننے پر مجبور کرتا ہے۔

آگے سیدہ شان معراج یوں لکھتی ہیں: "مولانا آزاد نے بھی ہر جینیس (Genius) کی طرح اپنی شعری ذوق سے مہمیز ہو کر کم عمری میں اسپ شعر کا راکب ہونے کا شرف حاصل کیا لیکن اسے شاعری کی بدقسمتی کہیے کہ آزاد بھی دوسرے جینیس (Genius) افراد کی طرح بتِ شعر سے سلسلہ راز و نیاز دراز نہ رکھ سکے ورنہ شاعری کے لئے جس سوز و گداز اور جذبات کے آتش سیال کی ضرورت پڑتی ہے اس کی کمی آزاد کے یہاں کبھی نہیں رہی۔اسے اردو شاعری کی بدقسمتی کہیے کہ ایک فطری شاعر سیاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گیا لیکن نثر کو سحر سامری عطا کر گیا"۔

مولانا آزاد نے اچھی شاعری کے لئے تفکر و وجدان، جذبات و جمالیات کے خوشگوار امتزاج کا جو معیار مقرر کیا تھا جس کا ثبوت انھوں نے دوسرے شعراء کے کلام کی پسندیدگی کے موقع پر بار بار دیا ہے خود اپنی شاعری کے لئے قائم نہ رکھ سکے تاہم یہ درست ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی غزل مطبوعہ "ارمغان فرخ" سے ارتقائی سفر کی کئی منزلیں طے کر لیں تھیں لیکن وہ اختتام شاعری تک بندشِ الفاظ کے نگینے جڑنے اور رعایت لفظی کی دکان سجانے سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔(مولانا ابوالکلام آزاد شخصیت اور شاعری ص494)

اس کی تائید میں سیدہ شان معراج نے بہت سارے اشعار پیش کی ہیں۔میں یہاں طوالت سے گریز کرتے ہوئے اُن کے چند اشعار پیش کرتا ہوں تا کہ ان کی فنی بصارت اور فکری بصیرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکے۔بلاتفریق چند اشعار پیش خدمت ہیں ملاحظہ ہوں۔

کیوں اسیرِ گیسوئے خم دار قاتل ہو گیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہو گیا
کوئی نالاں کوئی گریاں کوئی بسمل ہو گیا
اُس کے اُٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہو گیا
ان شوخ حسینوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
ایسوں کی اداؤں میں مزا اور ہی کچھ ہے
یہ دل ہے مگر دل میں بسا اور ہی کچھ ہے
دل آئینہ ہے جلوہ نما اور ہی کچھ ہے
سنتے ہیں رقیب سے ملاقاتیں ہیں
محبت دن رات ہے مداراتیں ہیں

ہم کو نہیں اعتبار جو چاہے کہو
عاشق سے وہ منہ لگائے یہ باتیں ہیں

مولانا کی شاعری کا ذکر ہواوراس میں انکا یہ قطعہ شامل نہ ہوتو بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بات ابھی نامکمل ہے۔لہذا چلتے چلتے ان کے اس قطعہ پرنظرڈالنا بھی ناگزیر ہے تا کہ اس امر کی نشاندہی ہو سکے کہ مولانا نے کس فن کاری اور چابکدستی سے سمندر کو کوزے میں بند کیا ہے، اتنا ہی نہیں یہ قطعہ اس بات کی طرف ذہن کو مبذول کرتا ہے کہ اختصار اور جامعیت کا امتزاج کسے کہتے ہیں اور کس طرح کہتے ہیں۔قطعہ یہ ہے جو تمام قارئین کو دعوت فکر دیتا ہے، ملاحظہ ہواور محظوظ بھی ہوں:

عوض نہ لے میرے جرم وگناہ بے حد کا
الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں، کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج
یہ انکے بندے ہیں جنکو کریم کہتے ہیں

گر قبول افتد زہے عز و شرف

بہار میں اردو زبان کا احیاء اور حکومتِ بہار کی کاوشیں

امیر معاویہ قاسمی دربھنگوی
کلکٹریٹ، مدھوبنی

اردو زبان وادب:

اردو زبان وادب نہ صرف ہندوستان کی گنگا-جمنی تہذیب اور مشترکہ ثقافت کی نمائندہ ہے بلکہ یہ ہمارے ماضی حال اور مستقبل کے علمی وراثت کی شناخت ہے؛ ریاست بہار جو اپنی علمی، ادبی اور تاریخی شناخت کے لیے پورے ملک میں ممتاز مقام رکھتی ہے ہمیشہ اردو زبان کے ایک زرخیز گہوارے کے طور پر جانی پہچانی جاتی رہی ہے۔

یہاں کے شعراء، ادباء، صحافی اور علمی اداروں نے اردو کی آبیاری میں ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا ہے؛ خوش آئند بات یہ ہے کہ حکومتِ بہار بھی اردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے سنجیدہ ہے اور اس نے اس مقصد کے لیے کئی اہم اور دوررس اقدامات کیے ہیں تاکہ اردو نہ صرف زندہ رہے بلکہ نئی نسلوں کے دلوں میں پوری آب وتاب کے ساتھ جگہ بنائے۔

حکومت بہار کی کاوشیں:

اردو زبان کی خدمت اور اس کے وقار کی بحالی کے نیک ارادے سے حکومتِ بہار نے 1980ء میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا؛ یہ ایک تاریخی اور انقلابی فیصلہ تھا جس نے نہ صرف اردو کے ادارہ جاتی اعتراف کی راہ ہموار کی بلکہ لاکھوں اردو داں شہریوں کے دلوں کو بھی اعتماد بخشا؛ اس فیصلے کے تحت حکومت نے تمام اضلاع، سب ڈویژن، بلاک اور انچل دفاتر میں نہ صرف اردو ملازمین کے عہدے منظور کیے بلکہ بڑی تعداد میں مترجم، نائب مترجم اور اردو ٹائپسٹوں کی باقاعدہ تقرری عمل میں آئی؛ اس اقدام کے نتیجے میں اردو کو سرکاری سطح پر ایک باوقار مقام حاصل ہوا اور اردو داں طبقے کو یہ موقع ملا کہ وہ اپنی مادری زبان میں دفتری امور انجام دے کر اپنے لسانی تشخص کو برقرار رکھ سکیں۔

اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں حکومتِ بہار کا ایک اور قابلِ تحسین اور پائیدار قدم "محکمہ اردو ڈائریکٹوریٹ" کا قیام ہے جو کابینہ سکریٹریٹ کے تحت قائم کیا گیا؛ یہ ادارہ اردو زبان کی ترقی، اس کے معیار کی بلندی اور افادیت کو موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مسلسل سرگرمِ عمل ہے؛ اس کا بنیادی مقصد اردو کو محض جذباتی یا تہذیبی وابستگی سے نکال کر ایک زندہ فعال معیاری اور قابلِ عمل زبان کے طور پر پیش کرنا ہے جو نہ صرف سرکاری نظام میں مؤثر ہو بلکہ تعلیمی میدان میں بھی نسلِ نو کے لیے قابلِ

فہم اور مفید ثابت ہو؛ چنانچہ اُردو ڈائریکٹوریٹ کے تحت ریاست کے تمام اضلاع میں اردو عمل گاہ (اساتذہ تربیتی ورکشاپس)، مشاعرے، ’’ضلع اردو نامہ‘‘ کی اشاعت، طلبہ وطالبات کے لیے تقریری مسابقے اور حوصلہ افزائی کے متنوع پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں اور حکومت بہار ان سرگرمیوں کے لیے بجٹ میں سے خاطر خواہ مالی وسائل مختص کرتی ہے جو اس کی سنجیدگی اور خلوص کی غمازی کرتا ہے۔

امتیاز احمد کریمی:

حکومت کی جانب سے اردو ڈائریکٹوریٹ کے کام کاج کی دیکھ ریکھ کے لیے ایک افسر مقرر ہوتے ہیں جنہیں ڈائریکٹر کہا جاتا ہے؛ ادارہ کے قیام سے لے کر آج تک جتنے بھی معزز ڈائریکٹرز اس ادارے سے وابستہ رہے ہر ایک نے اپنی علمی بصیرت انتظامی صلاحیت اور میسر وسائل کے دائرے میں رہتے ہوئے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں؛ ان تمام اربابِ دانش کی مخلصانہ کاوشیں بجاطور پر لائقِ تحسین ہیں اور وہ ہم تمام اہلِ اردو کی جانب سے بصمیمِ قلب شکریہ کے مستحق ہیں؛ تاہم اگر ہم مجموعی پیش رفت، مؤثر منصوبہ بندی، دور اندیش حکمتِ عملی اور اردو نواز پالیسیوں کے نفاذ کی بات کریں تو جناب امتیاز احمد کریمی کا دور ایک روشن اور نمایاں باب کی حیثیت رکھتا ہے جو اپنی وسعت، ہمہ گیری اور فعالیت کے سبب ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ان کے دور میں اردو ڈائریکٹوریٹ نے جس تیزی سے ترقی کی منازل طے کی نئے نئے منصوبے شروع کیے علمی وادبی سرگرمیوں کو وسعت دی اور اردو برادری کو جس انداز میں جوڑنے اور تقویت پہنچانے کی سنجیدہ کوششیں ہوئیں وہ قابلِ ستائش ہیں؛ ان کے دور میں ادارے کی کارکردگی میں جو نمایاں بہتری آئی اس کے اثرات نہ صرف ریاست بہار میں بلکہ دیگر ریاستوں میں بھی محسوس کیے گئے؛ یقیناً اردو زبان وادب کے فروغ میں جناب امتیاز احمد کریمی کے عملی اقدامات، وژن اور خلوصِ نیت کا بڑا دخل ہے اردو برادری ان کی ان گراں قدر خدمات کے لیے ہمیشہ ان کی شکر گزار اور احسان مند رہے گی۔

ایس ایم پرویز عالم:

اردو ڈائریکٹوریٹ کے موجودہ ڈائریکٹر جناب ایس ایم پرویز عالم صاحب کی شخصیت علمی وقار، تہذیبی شعور اور انتظامی مہارت کا حسین امتزاج ہے؛ وہ ایک خاموش طبع بردبار اور سنجیدہ فکر کے حامل شخص ہیں جن کے قول میں مٹھاس اور عمل میں گہرائی پائی جاتی ہے؛ آپ اردو کے ادیب ہیں اور کلاسیکی وجدید ادبی رجحانات سے واقفیت کے ساتھ بہترین شاعر بھی ہیں؛ آپ اردو زبان و ادب کی تشکیل وتدوین اور لسانی نفسیات سے بخوبی واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ آپ ادبی محفلوں کی زینت بنے رہتے ہیں؛ ان کی گفتگو میں علمی متانت اور لب و لہجے میں شائستگی نمایاں ہے جو انہیں دیگر منتظمین سے ممتاز کرتی ہے؛ ان کے ڈائریکٹر بنتے ہی فروغ اردو کے لئے ہمہ جہت کاوشوں میں جو تیزی آئی ہے وہ ان کی اردو کے تئیں دلچسپی کا مظہر ہے اب تک ان کی طرف سے کئے گئے اقدامات کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے۔

معاون اردو مترجم کی بحالی کا مسئلہ گزشتہ پانچ سالوں سے تعطل کا شکار تھا، اس حوالے سے اردو برادری میں مایوسی بڑھ رہی تھی اور ہزاروں اردوداں نوجوان اپنے روزگار کے تعلق سے مستقبل کو دھندلا محسوس کر رہے تھے؛ ایسے نازک موقع پر جناب پرویز عالم

صاحب نے ایک مخلص رہنما کا کردار ادا کرتے ہوئے معاون اردو مترجم کی بحالی اولین ترجیحات میں رکھا اور رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے فوراً بحال کر دیا جس سے آٹھ سوا کاون گھروں میں خوشی کی لہر آئی؛ مزید یہ کہ ان کی کوششوں سے حکومت بہار کے مختلف مرکزی دفاتر کے علاوہ ضلع دفاتر اور پولیس آفس میں معاون اردو مترجم کی نئی اسامیوں کی منظوری دی گئی جو ایک تاریخی پیش رفت ہے۔

انہوں نے اردو زبان کو محض ملازمتوں تک محدود رکھنے کی روایت کو توڑتے ہوئے یہ واضح پیغام دیا کہ اردو کی حیثیت ایک مکمل سرکاری زبان کی ہے جسے روزمرہ کی دفتری کارروائی، احکامات، اعلانات اور سرکاری مراسلت میں برابری کے ساتھ شامل کیا جانا چاہیے؛ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف حکومتِ بہار کے اردو سے متعلق احکام کی وقتاً فوقتاً یاددہانی متعلقہ دفاتر کو کراتے رہتے ہیں بلکہ عملی سطح پر ان پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے پوری سنجیدگی سے کوشاں رہتے ہیں؛ چاہے بات ہو دفاتر میں اردو میں افسران کے ناموں کی تختیوں کی تنصیب کی یا سرکاری عمارتوں کے نام اردو میں نمایاں کرنے کی پرویز عالم صاحب ان اقدامات کو محض رسمی کارروائی کے بجائے زبان کی عزت و وقار سے جوڑ کر دیکھتے ہیں؛ وہ صرف احکامات جاری کرنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان پر عمل درآمد کا باقاعدہ جائزہ لیتے ہیں اور اس کی رپورٹیں بھی طلب کرتے ہیں تا کہ اردو کی سرکاری سطح پر نمائندگی محض کاغذی نہ رہے بلکہ حقیقت میں دکھائی دے۔

ان کے نزدیک اردو زبان کا فروغ محض ایک سرکاری ذمہ داری نہیں بلکہ دل سے جڑی ہوئی ایک ذاتی وابستگی ہے ان کی مسلسل کوششوں نے اردو تحریک کو نہ صرف ایک نئی جہت عطا کی ہے بلکہ اس میں ایک تازہ روح اور عملی توانائی بھی بھری ہے؛ ان کی مساعی کے اثرات آج اردو برادری کے مختلف طبقات تک واضح طور پر محسوس کیے جا رہے ہیں خصوصاً اُن ہزاروں نوجوانوں کے لیے جو اردو زبان میں تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمت کے مواقع کے متلاشی ہیں؛ ان کی یہ کاوشیں اندھیرے میں چراغ کا کام دے رہی ہیں اور ایک روشن مستقبل کی نوید سنا رہی ہیں؛ اس لئے یہ کہنا بجا ہے کہ ایس ایم پرویز عالم صاحب جیسے افسر اردو زبان کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہیں اور اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ان کی کاوشیں قابلِ تقلید اور لائقِ ستائش ہیں۔

دردمندانہ گزارش:

آخر میں اردو داں طبقے سے بس اتنی سی گزارش ہے کہ حکومتِ بہار نے اردو کے فروغ کی راہ ہموار کر دی ہے اب ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس راہ کو اپنی کاوشوں وابستگی اور عملی اقدامات سے روشن کریں یہی اردو سے سچی محبت ہے اور اسی میں اردو کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے؛ اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نئی نسل کے دلوں میں اردو کی محبت کو پھر سے زندہ کریں گھروں میں اردو بولیں بچوں کو اردو کتابوں سے روشناس کرائیں؛ اسکولوں، کالجوں یا سرکاری سطح پر منعقد ہونے والے اردو زبان و ادب کے پروگراموں میں بچوں کی شمولیت کو یقینی بنائیں؛ عوامی رابطے میں بالخصوص سوشل میڈیا پر اردو کو وقار دیں اور سب سے بڑھ کر اردو کو اپنی شناخت اور فخر کا حصہ بنائیں۔

مدھوبنی میں اردو زبان وادب: روایت، ارتقا اور جہات

شائق یکھتوی

اردو ایک زندہ جاوید زبان ہے جو برصغیر کی مشترکہ تہذیب کی خوبصورت علامت ہے۔ یہ زبان مختلف تہذیبوں زبانوں اور روایتوں کے حسین امتزاج کا نتیجہ ہے جس میں سنسکرت، پراکرت، عربی، فارسی اور ترکی کے عناصر شامل ہیں اردو زبان کی یہ ہمہ گیریت اور شیرینی اسے نہ صرف برصغیر کی ایک بڑی زبان بناتی ہے بلکہ عالمی ادب میں بھی ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

اردو زبان کی پیدائش اگرچہ دہلی اور اس کے گردونواح میں ہوئی لیکن اس میں باقاعدہ ادبی تخلیق کا آغاز دکن سے ہوا" کدم راؤ پدم راؤ" اردو کی پہلی مثنوی تسلیم کی جاتی ہے جو پندرہویں صدی عیسوی میں منظر عام پر آئی؛ ولی دکنی کو اردو غزل کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے جنھوں نے اردو غزل کو مستحکم بنیاد فراہم کی، جب ان کا دیوان شمالی ہند پہنچا تو وہاں کے شعراء اردو یعنی ریختہ میں شعر کہنے لگے اس سے پہلے وہاں کے شعراء فارسی میں شاعری کرتے تھے؛ اردو زبان میں ابتدائی نثر کے نمونے اسی دور کے صوفیائے کرام کی ان کتابوں میں ملتے ہیں جن میں ان کے ملفوظات اور تعلیمات کو جمع کیا گیا ہے یہ کتابیں اگرچہ عمدہ نثر کے نمونے نہیں ہیں لیکن ان کی تاریخی حیثیت مسلم ہے۔

مغلیہ دور حکومت میں اردو ادب نے شمالی ہند میں اپنی شناخت قائم کی اور میر غالب اور سودا جیسے شعراء نے اردو غزل کو نئی جہت سے روشناس کرایا؛ انیسویں صدی کے اواخر میں اردو ادب نے جدیدیت کی طرف قدم بڑھایا۔ سرسید احمد خان کی تحریک نے اردو نثر میں سائنسی اور تحقیقی طرز کو فروغ دیا۔ حالی شبلی اور آزاد نے جدید شاعری اور تنقید کی بنیاد رکھی۔

مدھوبنی میں اردو زبان وادب کا فروغ:

شمالی بہار کا ضلع مدھوبنی اپنی تہذیبی ثقافتی اور لسانی روایت کے باعث نہ صرف ریاست بہار بلکہ پورے ہندوستان میں ممتاز مقام رکھتا ہے۔ یہاں اردو زبان کا فروغ ایک فطری عمل رہا ہے جسے دینی مدارس، عصری تعلیمی ادارے، شعری نشستیں، ادبی انجمنیں اور صحافتی کوششیں برابر تقویت پہنچاتی رہی ہیں؛ بزم شمال، رفتگاں وقائماں اور دیگر مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے فنکاروں نے ہر دور میں اپنی فنکارانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے مدھوبنی کے ایک عظیم فنکار ودیاپتی (پیدائش 1350ء۔ وفات 1440ء) کی تخلیقات میں اردو کے کئی الفاظ ملتے ہیں جن کی نشاندہی متھلا کے عظیم محقق، شاداں فاروقی نے بزم شمال میں کی ہے تاہم یہاں باضابطہ اردو شاعری کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر میں ہوا۔

اس ضلع میں 227 سرکاری وغیر سرکاری مدارس اسلامیہ اور 1036 مکاتبِ دینیہ قائم ہیں جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے اور اس میں کوئی دورائے نہیں کہ اردو زبان کی ابتدائی تعلیم وتدریس کے نتیجے میں ہی اردو شعروادب کا شعور بیدار ہوتا ہے؛ ان مدارس میں زیرِ تعلیم طلباء اور یہاں کے فضلاء اردو زبان سے نہ صرف اپنا رشتہ استوار رکھتے ہیں بلکہ شعری وادبی ذوق کا ثبوت بھی دیتے رہتے ہیں۔ یہاں کے مشہور دینی اداروں میں مدرسہ رحمانیہ یکہتہ، مدرسہ چشمہ فیض ململ، مدرسہ فلاح المسلمین گواپوکھر بھوارہ، مدرسہ قدرتیہ شکری، مدرسہ احمدیہ مومن ٹولہ، مدرسہ اسلامیہ راگھونگر بھوارہ، مدرسہ اتحاد المسلمین باگھا کسمار، مدرسہ حنفیہ عربک کالج جمیلا گیدر گنج، مدرسہ اسلامیہ اندھرا ٹھاڑی، مدرسہ سراج العلوم سنگرام، مدرسہ نصرۃ العلوم زہیابازار وغیرہ شامل ہیں۔

تعلیمِ نسواں کے لیے بھی کئی مدارس موجود ہیں جن میں مدرسۃ البنات رحمانیہ یکہتہ، مدرسہ معہد البنات یعقوبیہ یکہتہ، جامعہ فاطمۃ الزہرہ ململ، مدرسہ عائشہ نور چک بسفی وغیرہ اہم ہیں؛ عصری علوم کے لیے سرکاری اسکول اور کالج بھی ہیں لیکن آبادی کے تناسب سے ناکافی ہیں؛ البتہ پرائیویٹ اسکولوں کی بہتات ہے، کوچنگ سینٹروں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے، پورے ضلع میں ایک بھی یونیورسٹی نہیں ہے، یہاں کے تمام کالج متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے ماتحت ہیں، یہاں کے طلبا اعلیٰ تعلیم کے لئے ملک کی دیگر یونیورسٹیوں کا رخ کرتے ہیں۔

مدھوبنی میں ہر دور میں شاعری کو نثر پر فوقیت حاصل رہی ہے؛ اس لیے یہاں شعرا کی ایک کہکشاں آباد نظر آتی ہے۔ مدھوبنی میں نیرنگ مململی اور مہر شکروی کا دور شعروادب کے ارتقا کا دور تھا؛ اس زمانے میں ململ، یکہتہ، شکری، برداہا وغیرہ جیسے قصبات و دیہات میں بکثرت شعری نشستوں اور ادبی محفلوں کا انعقاد ہوا کرتا تھا، بایں وجہ یہاں خوشگوار ادبی وشعری فضا قائم ہو چکی تھی، اس عہد کے شعرا میں ماہر رضوی، عبدالعلام ہوش، حامد حسین جوش، عبدالعزیز مضحل، عبدالحفیظ حافظ، مطیع الرحمن احقر وغیرہ اہم ہیں۔

مدھوبنی کے شعرا نے غزل، نظم، قصیدہ، تاریخ گوئی اور مرثیہ جیسے تمام مشہور اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اس خطے کے بیشتر شعرا کے اشعار میں وہ سارے اوصاف نمایاں ہیں جو کسی شاعری کو قومی دھارے سے جوڑتے ہیں، ذیل میں چند شعراء وادباء کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ماہر رضوی اپنے خلوص کے سبب عوام وخواص میں مقبول تھے انہوں نے اپنی نظم نگاری کے ذریعے متھلا کے چھوٹے سے ادبی ماحول میں پے در پے طوفان اٹھا کر اپنا مقام بنایا؛ "تجدیدِ پیمانِ وفا"، "کسی کی مسکراہٹ" اور "تسخیرِ کائنات" ان کی وہ منفرد نظمیں ہیں جنہیں ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ملی۔ مولانا عبدالعلیم آسی دربھنگوی نے 1944ء میں "ادارہ اردو" کے نام سے ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی تو ماہر رضوی اس کے پہلے صدر بنائے گئے، انجمن ترقی اردو مدھوبنی کے عرصہ دراز تک سربراہ رہے۔

پاتا ہوں سامنے اسی بے داد گر کو میں
دل کو چراؤں اب کہ بچاؤں جگر کو میں

نیرنگ مململی مجنوں گورکھپوری کے ہم عصر شاعروں میں تھے، شیرِ بنگال شہید سہروردی اور چودھری خلیق الزماں جیسے مسلم رہنماؤں سے یارانہ تعلق تھا اور بنگال کی محفلِ شعروادب میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے: ان کی نظم "علی گڑھ" اور "اپریل

فول" بہت مقبول ہوئی۔ نثر نگاری سے بھی خاصا شغف تھا ایک ناول یادگار کے طور پر محفوظ تھا لیکن افسوس! شعری اثاثے کی طرح ان کا نثری سرمایہ بھی لاپرواہی کے سبب تباہ و تلف ہو گیا۔

ہاتھ دھونا ہی پڑے گا جان سے
عشق کرنے کا یہی انجام ہے

•••

عبد العلام ہوش اور حامد حسین جوش کی تخلیقات میں سوائے چند اشعار کے کچھ بھی محفوظ نہیں جناب ہوش نے تو کبھی بیاض کا اہتمام کیا ہی نہیں اور جوش صاحب کی شعری بیاض ضائع ہو گئی۔

وہ مڑ کے دیکھے نہ دیکھے ہماری قسمت ہے
پڑے ہوئے سر رہ گزار ہم بھی ہیں
(ہوش شکروی)
یہ کس میکش کی آمد ہے یہ کس کا خیر مقدم ہے
کہ ساقی خود لیے ساغر سبو پیمانہ آتا ہے
(جوش شکروی)

عبد العزیز مضمحل کے تین غیر مطبوعہ مسودے وسائل کی کمی کے سبب منظرِ عام پر نہ آ سکے اور سب نذرِ دیمک ہو گئے۔

مہر شکروی اپنے دور کے خوش نصیب شاعر تھے بایں معنی کہ ان کے مجموعہائے کلام ان کی زندگی میں ہی شائع ہو گئے۔ رحمت کے پھول 1950ء میں، عقیدت کے پھول 1952ء میں، جنت کے پھول 1956ء میں، مظلوم حسین 1975ء میں اور شعاعِ مہر 1980ء میں وقفے وقفے سے منصہ ءشہود پر آتے رہے؛ مہر شکروی زود گو شاعر تھے جہاں بیٹھتے فی البدیہہ دو چار غزلیں کہہ دیتے انہوں نے شعر و شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا؛ شوق نیموی ناصر دہلوی اور جگر مراد آبادی جیسے عظیم شاعروں کے ساتھ کئی مشاعرے پڑھنے کے مواقع میسر آئے؛ ہزار کی تعداد میں ان کے شاگرد ہیں ان کی شاعرانہ عظمت کے عرفان کے لیے ایک واقعہ نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے متھلا کے عظیم محقق و مؤرخ جناب شاداں فاروقی نے اپنی کتاب بزم شمال میں یہ شعر نقل کیا ہے:

پس مردن بھی باقی ہے خلش دردِ محبت کی
لحد میں دونوں ہاتھوں سے کلیجے کو سنبھالے ہیں

اور لکھا ہے کہ یہ شعر مونگیر کے ایک مشاعرے میں بہت پسند کیا گیا تھا حضرت جگر مراد آبادی نے بڑی داد دی تھی۔

مطیع الرحمن احقر قادر الکلام اور پیامی شاعر تھے زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل تھی؛ وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز صحافی خوش اخلاق اور اصول پسند انسان تھے حق گوئی و بے باکی ان کی فطرت میں شامل تھی؛ ان کا شعری مجموعہ ان کے انتقال کے دس سال بعد" آواز انداز" کے نام سے 2001ء میں شائع ہوا:

تیرے فیض کرم کی نورافشانی نہیں جاتی

میرے دل کی مگر تاریک سامانی نہیں جاتی

مولانا عبدالحفیظ حافظ کے اشعار میں صوفیانہ افکار، نغمگی، سادگی و پرکاری اور مضمون کی گہرائی ملتی ہے؛ ان کا مجموعہ سخن "کشکولِ محبت" پچیس سال بعد 2017ء میں منظرِ عام پر آیا۔

میرا جنون شوق ہی رہبر راہ عشق ہے

امید ہے صبح میں شب یاس کی تیرگی نہیں

ایک طرف ان بزرگوں کی سرگرمیوں سے مدھوبنی کا ادبی افق منور تھا تو دوسری طرف اسی دور کے تازہ دم فنکاروں نیاز احمد نیاز، سلطان شمسی، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر غلام قدوس فہمی، قاصر کرم پوری وغیرہ کی ذہنی آبیاری ہو رہی تھی۔

جناب نیاز احمد نیاز تقریباً چار پانچ دہائیوں سے گیسوئے غزل کی مشاطگی کر رہے ہیں، فی الوقت دربھنگہ کی متحرک و فعال ادبی انجمن "بزمِ رہبر" کے نائب صدر ہیں اور صغریٰ گرل اسکول کے سکریٹری۔ ان کا شعری مجموعہ "قبائے زیست" ابھی حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔

دمشق و شام معصوموں کا مقتل

بنام امن ہی جور و ستم دیکھ

سلطان شمسی مدھوبنی کے ادبی افق پر جگمگاتا ہوا وہ روشن ستارہ ہے جس کی ضیا پاش کرنوں سے یہاں کی ادبی و شعری فضا منور ہے، ان کے دو شعری مجموعے "ریت کا سفر" اور "اندازِ سخن" منظر عام پر آ چکے ہیں۔

ہر پھول پہ ہر شاخ پہ ہے یاس کا عالم

خاک ایسے گلستاں کو ہم آباد کریں گے

ڈاکٹر غلام قدوس فہمی کثیر التصانیف، کہنہ مشق، معمر اور بزرگ شاعر ہیں؛ عرصہ ءدراز تک میدانِ شعر و ادب میں سرگرم رہے تقریباً دو درجن سے زائد ان کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصنیفات و تالیفات ہیں جن میں آئینہ اقبال، تفہیم اقبال، آئینہ گل اور گلشنِ مدینہ وغیرہ اہم ہیں۔

وہ شہر جس کی گلیوں میں ہو نفرتوں کی آگ

آباد کون ہوگا وہاں گھر خرید کر

ڈاکٹر مشتاق احمد کثیر الجہات شخصیت کے حامل ہیں، ایک اچھے شاعر و ادیب، محقق و ناقد اور بہترین کالم نگار ہیں؛ عصر حاضر کے سلگتے مسائل پر قلم برداشتہ لکھتے ہیں، ہندوستان کا شاید ہی کوئی اخبار ہو جس میں ان کے مضامین نہ چھپے اور چھپتے ہوں، اعلیٰ تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں؛ "تنقیدی بصیرت"، "تنقیدی تقاضے"، "میزانِ سخن" اور "طنابِ نقد" ان کی تنقیدی و تحقیقی کتابیں ہیں؛ "آتشِ پنہاں" ان کا شعری مجموعہ ہے، افسانہ نگاری سے بھی خاصی دلچسپی ہے، ان کا افسانوی مجموعہ "انسان زندہ" کے نام سے شائع ہو چکا

ہے، 2001ء سے دربھنگہ سے ایک خالص ادبی سہ ماہی رسالہ ”جہانِ اردو“ نکال رہے ہیں۔

قاصر مکرم پوری نہایت سنجیدہ، وضع دار، خوش اخلاق اور نستعلیق شخصیت ہیں اور ان کے کلام میں بھی یہ سارے اوصاف نمایاں ہیں ”تمنا کا دوسرا قدم“ ان کا مطبوعہ شعری مجموعہ ہے۔

دل گرفتہ ہو گرفتارانا ہو کیا ہو
کچھ کہو بھی کہ زمانے کو پتہ ہو کیا ہو

امجد علی سرور کا شمار استادالشعراء میں ہوتا ہے، انہوں نے دوحہ قطر میں ایک ادبی انجمن ”داستانِ ادب قطر“ کی بنیاد رکھی جہاں ان سے نو آموز شعراء فن شاعری سیکھتے اور شاعری کے اصل رموز و نکات سے واقف ہوتے رہے، درجنوں ان کے شاگرد ہیں۔ ”ضیاء حرمین“، ”ندائے حرمین“، ”کرن کرن آفتاب“ اور ”یادوں کی روشنی“ چاروں آپ کے مطبوعہ شعری مجموعے ہیں۔

جھونپڑے سارے فٹ پاتھ کے جل گئے
شہر میں نوحہ خواں کوٹھیاں رہ گئیں

ڈاکٹر حلیمہ سعدیہ شگفتہ مدھوبنی کے شعری افق پر نمودار ہونے والی پہلی شاعرہ ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ”غنچہ پھر لگا کھلنے“ زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔

یا رب شب الم کی کوئی تو صبح ہوگی
اشکوں سے میں شگفتہ شمعیں جلا رہی ہوں

مولانا فضیل احمد ناصری مشہور عالم دین اور صاحبِ طرز ادیب ہیں، قرآن و حدیث کی خدمت کے ساتھ ساتھ شعری و ادبی خدمات بھی انجام دیتے ہیں؛ آپ نظم و نثر ہر دو کے ذریعے ملتِ اسلامیہ کو واضح پیغام دیتے نظر آتے ہیں، دینی حلقوں میں ”اقبال ثانی“ کی حیثیت سے متعارف ہیں ”حدیث عنبر“ اور ”آؤ کہ لہو رولیں“ آپ کے شعری مجموعے ہیں، ان کے علاوہ بھی کئی کتابیں زیورِ طبع سے آرستہ ہو چکی ہیں جن میں ”یادوں کی بارات“ (خاکوں کا مجموعہ) قابلِ ذکر ہے۔

حدیث مرسلاں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
تری فطرت ہے افلاکی سراپا آسماں ہو جا

ڈاکٹر صدر عالم گوہر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازے جاچکے ہیں، بیک وقت کئی زبانیں جانتے ہیں، مختلف زبانوں میں درجنوں کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

کہے حال دل کوئی کیسے کسی سے
کہ ڈرتا ہے اب آدمی آدمی سے

مدھوبنی کی ادبی خدمات صرف شاعری تک محدود نہیں رہیں بلکہ نثر نگاری، تحقیق و تنقید، ترجمہ نگاری اور صحافت میں بھی یہاں کے اہلِ قلم نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔ ابتدائی دور میں اشاعتی سہولتیں فراہم نہ ہونے کے باوجود ہمیں نثری نمونے ملتے ہیں۔

مولانا عبدالرزاق بن عبداللہ راگھونگری (پ:1867ء و:1982ء) کی دوقدیم مطبوعہ تصانیف دستیاب ہیں: ایک قرات خلف الامام اور دوسری آمین بالجہر۔ مولانا محمد اسحاق ہرپوری کی بھی ایک قدیم تصنیف "مرقاۃ المبتدی لوجوب انصات المقتدی" ہے جس پر تاریخ طباعت درج نہیں البتہ اس کی لکھاوٹ اور کاغذ سے اس کی قدامت کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے، یہ کتاب 32 صفحات پر مشتمل ہے اور مطبع سلیمی برقی یحییٰ الہ آباد سے شائع ہوئی ہے۔

مولانا عبدالرزاق مکیاوی قاسمی (متوفی 1958ء) شیخ الہندؒ کے جیدالاستعداد تلامذہ میں تھے اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے درسی ساتھی تھے، مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بھی یارانہ تعلق تھا، ان کی ایک کتاب حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ تھی 2004ء کے سیلاب میں نذرِ آب ہوگئی، باقی کتابیں ان کے وارثین کے مطابق مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کو بھیج دی گئیں؛ مولانا شعروشاعری کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، حضرت زین العابدینؒ کی لکھی ہوئی نعت کا انہوں نے منظوم اردو ترجمہ کیا تھا جو ان کی ذاتی ڈائری میں درج ہے، وہ ڈائری مولانا خورشید عالم ندوی حال مقیم بنگلور کے ہاتھ لگی ہے۔

مولانا عتیق الرحمن قاسمی چندرسین پوری (پ:1936ء و:1988ء) کی کئی تصانیف موجود ہیں، انھوں نے شعروسخن کا عمدہ ذوق پایا تھا؛ اس لئے ان کی اکثر تصنیف نظم میں ہے اور قلمی ہے جس میں یادِ حرم منظوم اردو، مسائلِ روزہ منظوم اردو، علاماتِ قیامت منظوم، پردہ کتاب وسنت کی روشنی میں، ایثار السنن مع حاشیہ افکار الحسن، العقائد الحاوی ترجمہ اردو عقیدۃ الطحاوی اور ایک مجموعۂ کلام گلہائے رنگارنگ قابلِ ذکر ہیں۔ (تذکرہ علمائے بہار۔ ج:1۔ص:362)

سید احمد جامی کا نام گنیز آف بک ریکارڈ میں درج ہے، ان کی گراں تصنیف لغات ابجدی شماری چار جلدوں میں ہے، ان کو شعروشاعری سے بھی گہری مناسبت تھی۔ پروفیسر اختر الحسن پنڈولوی کی تصنیفات میں عبدالغفور شہباز: حیات اور ادبی خدمات، سلام مچھلی شہری: حیات اور شاعری اور علامہ اقبال کی اردو نظموں کا انگریزی ترجمہ شامل ہیں۔ پروفیسر اظہار احمد کی مطبوعہ تصنیف "مراثی شاد کا فکری پہلو" ہے۔

ڈاکٹر منظور عالم رانی پور نظرا کی خدمات کا دائرہ کئی پہلوؤں پر مشتمل ہے، وہ ایک معروف اسلامی اسکالر ہیں انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز کے بانی وچیرمین اور آل انڈیا ملی کونسل کے جنرل سکریٹری بھی ہیں، نہایت فعال ومتحرک شخصیت کے حامل ہیں، متعدد قومی وبین الاقوامی تنظیموں کے رکنِ تاسیسی ہیں۔ ان کی کئی کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آچکی ہیں، صحافت سے گہری دلچسپی ہے، "نقطۂ نظر" کے عنوان سے مستقل کالم لکھتے ہیں۔ سماجی اور ملی کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں، دہلی سے ماہنامہ "ملی اتحاد" ان کے زیرنگرانی شائع ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر ماہر معاشیات ہیں، پروفیسر سلطان احمد کی تصنیف "میرانیس بحیثیت رباعی نگار" منظرِ عام پر آچکی ہے۔

جناب عبدالمجید کی پانچ مطبوعہ تصانیف آسان اردو ٹائپ رائٹنگ، آسان اردو شارٹ ہینڈ، آسان اردو لغت، آسان کتاب الجی اور آؤ اردو سیکھیں ہیں۔

منور سلطان ندوی نوجوان عالم دین اور صحافی ہیں، قریب درجن بھر کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں، "ندوۃ العلماء کا فقہی

مزاج" ان کی مشہور تصنیف ہے۔

عادل حیات شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ناقد بھی ہیں اور مضمون نگار بھی۔ ان کی کئی کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں "اختر انصاری اور ان کی غزل گوئی" (تحقیق وتنقید)، "غزل کی تنقید"، "انوکھا اسکول" (بچوں کی کہانیاں)، "ستارہ سنگ" (شعری مجموعہ) وغیرہ اہم ہیں۔

دنیائے ادب کا ایک اہم نام ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کا ہے، بہت کم وقت میں اپنی بصیرت مندی اور تخلیقی صلاحیت کے سبب اپنی شناخت بنا چکے ہیں؛ ادب امکان، تمثیل نو اور ادبی صحافت کا نقش ان کی مشہور کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر سعود عالم قاسمی قومی سطح پر اسلامی اسکالر کے روپ میں اپنی مضبوط شناخت رکھتے ہیں۔ اسلام اکیسویں صدی میں، اسلامی معاشرے میں مساجد کا کردار، حضرت شاہ ولی اللہ کی قرآنی فکر کا مطالعہ، شبلی کی قرآن فہمی، اسلام اور عصر حاضر کے مسائل، موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لیے راہ عمل، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی تحریک، عصر حاضر میں اسوۂ رسول کی معنویت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی افکار و آثار، مولانا سید احمد اکبر آبادی احوال و آثار، مطالعۂ مذاہب کی اسلامی روایت، فتنہ وضع حدیث اور موضوع احادیث کی پہچان وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین یونسی کی کتابیں تلاشِ ادب، امام بخش صہبائی کی ادبی خدمات، محاوراتِ نکہت اور ناول دو گز زمین کی حقیقت وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ کئی ادیب و شاعر اپنے قلم کی جلوہ سامانیاں بکھیر رہے ہیں اور دنیائے ادب کو اپنی نگارشات سے مسحور کر رہے ہیں۔

مدھوبنی کے افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر قیام نیر، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، سہیل احمد سہیل، ڈاکٹر مشتاق احمد وغیرہ کے نام آتے ہیں؛ ان حضرات کے افسانے نہ صرف یہ کہ ملک کے معیاری رسائل وجرائد میں چھپتے ہیں بلکہ کئی افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں ؛ ڈاکٹر قیام نیر درجنوں کتابوں کے خالق ہیں "تنہائی کا کرب"، "تحفہ" اور "دھندن" ان کے افسانوی مجموعے ہیں، ان کی دوگرانقدر تصنیف "بہار میں اردو افسانہ نگاری" (تنقید و تحقیق) اور "بہار و جھارکھنڈ میں اردو افسانہ اور افسانہ نگار" بھی قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر مجیر احمد آزاد فعال و متحرک ہیں آئے دن اخبارات و رسائل میں تبصرے مضامین اور افسانے چھپتے رہتے ہیں نصف درجن سے زائد کتابیں منظرِ عام پر آ کر قارئین سے داد و تحسین وصول کر چکی ہیں، "ڈوم"، "اندھیرے کا کرب"، "جھکی ہوئی شاخ"، "ٹھہری ہوئی صبح"، "دور دیس میں" ان کے مطبوعہ افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "دربھنگہ میں اردو افسانہ نگاری" کو بھی کافی پذیرائی مل چکی ہے۔

مدھوبنی شعر و ادب کے ساتھ ساتھ میدانِ صحافت میں بھی پیش پیش رہا ہے، اس کی صحافتی تاریخ بھی قدیم ہے، آزادی سے قبل یہاں کے صحافیوں نے "الہلال" و "البلاغ" اور امارت شرعیہ پٹنہ سے نکلنے والا ہفت روزہ جریدہ "امارت" سے جڑ کر اپنی صحافتی خدمات انجام دی ہیں؛ اول الذکر دونوں اخبار اردو صحافت میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان دونوں میں مدھوبنی کے صحافی مولانا نور الہدیٰ نور قاسمی ململی کا خونِ جگر شامل ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کو ان پر کافی اعتماد تھا، وہ البلاغ کے صرف نائب مدیر ہی نہیں تھے بلکہ بقولِ صاحبِ رفتگاں وقائماں "ایک عبوری مدت کے لیے البلاغ کی پوری ذمہ داری مولانا آزاد نے ان کے سپرد کر دی تھی"۔

مولانا عبدالرزاق ملکیاوی نے ہفت روزہ جریدہ "امارت" کو اس کے ابتدائی دور میں اپنی خدمات پیش کیں، وہ 1925ء سے 1936ء تک اس سے وابستہ رہے۔

مدرسہ چشمہ فیض ململ سے دسمبر 1986ء میں ڈاکٹر عطا عابدی کی ادارت میں پندرہ روزہ اخبار "مسافر" منظرِ عام پر آیا اور اس کا دوسرا شمارہ 1987ء میں شائع ہوا، یہ مدھوبنی کا پہلا اردو جریدہ ہے، اس کے ہر دو شمارے کا غالب حصہ ادبی امور پر مشتمل تھا۔ 2002ء میں یکہتہ سے سالانہ میگزین "نشانِ منزل" کا اجرا عمل میں آیا، اس کے چیف ایڈیٹر مولانا منور سلطان ندوی اور نائب ایڈیٹر مولانا نوشاد عالم ندوی تھے، 2003ء میں اس کا دوسرا شمارہ منظرِ عام پر آیا، افسوس! اس کا سفر دو قدم سے آگے جاری نہ رہ سکا۔

مدرسہ چشمہ فیض ململ سے 2003ء میں سہ ماہی "بصیرت" مولانا غفران ساجد قاسمی کی ادارت میں شائع ہوا، اس کے سات شمارے منصۂ شہود پر آئے، پھر رجسٹریشن کی ضرورت کے سبب "ندائے بصیرت" کے نام سے چھپنے لگا؛ 2010ء تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس کے ہر شمارے میں مذہبی اور سیاسی مضامین کے علاوہ شعر و ادب کا خاص کالم ہوتا تھا۔ اسی مدرسے میں ایک انجمن "جمعیۃ الاصلاح" برسوں سے قائم ہے جہاں طلباء میں صحافتی ذوق پیدا کرنے کے لیے اردو میں "شاہین"، عربی میں "الحرا"، ہندی میں "کرانتی" اور انگریزی میں 'The Light' کے نام سے دیواری پرچہ نکلتا ہے اور جامعہ فاطمۃ الزہرا میں زیرِ تعلیم طالبات کی صحافتی تربیت کے لئے ماہنامہ "اقرا" (اردو) خاص ہے، یہ صرف جداری پرچہ تک محدود نہیں بلکہ سالانہ مجلہ کی شکل میں شائع ہو کر عام قارئین تک بھی پہنچ رہا ہے۔

2013ء میں مدرسہ محمود العلوم دملہ سے "ندائے محمود" شائع ہوا، اس کے ایڈیٹر مولانا عمر فاروق قاسمی تھے، تقریباً تین سال تک اس کی اشاعت جاری رہی۔ حال ہی میں مدرسہ معہد البنات یعقوبیہ یکہتہ نے "صدائے ممتاز" کے نام سے سہ ماہی رسالہ محمد ضیاء الحق ندوی کی ادارت میں نکالا ہے، اس کے تین شمارے منظر عام پر آئے۔

مطیع الرحمن احقر کو شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی خاصی دل چسپی تھی وہ برسوں اخبار "دعوت" دہلی کی مجلسِ ادارت سے وابستہ رہے اور فکر و نظر کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ عالمی شہرت یافتہ عالم دین مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہریؒ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اگرچہ عربی زبان و ادب کے استاد تھے لیکن اردو زبان و ادب سے بھی خاصا شغف رکھتے تھے، انھوں نے پندرہ روزہ "تعمیر حیات" لکھنؤ اردو کے مدیر مسئول، ہفت روزہ "ندائے ملت" اور سہ ماہی "کاروان ادب" کے ادارتی رکن کی حیثیت سے صحافتی خدمات انجام دیں، ان کی ایک کتاب "مغربی میڈیا اور اس کے اثرات" کافی مقبول ہوئی، اس کے متعدد زبانوں جیسے عربی، انگریزی، ملیالم اور بنگلہ وغیرہ میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

الغرض مدھوبنی کی اردو ادبی روایت صرف ماضی کی گواہی نہیں بلکہ حال کی پہچان اور مستقبل کی امید ہے، یہاں کے شعراء و ادباء نے نہ صرف اپنے اشعار و افکار سے مقامی ادبی فضا کو معطر کیا بلکہ پورے اردو منظرنامے کو اپنی تخلیقی بصیرت سے مالا مال کیا ہے؛ ہمیں چاہیے کہ ہم ان ادبی سرمائے کو محض فخر کا باعث نہ بنائیں بلکہ انہیں آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی فکر کریں، یہی زبان و ادب کی بقا کی ضمانت ہیں اور یہی مدھوبنی کی حقیقی علمی و تہذیبی خدمت ہوگی۔

فراق شناسی: شمس الرحمن فاروقی اورابوالکلام قاسمی کی نظر میں

تجمل حسین
ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسیٹی دہلی
موبائل نمبر:7905623176

روایت کی پاسداری اور جدید آہنگ کی آمیزش سے جن شاعروں نے اپنی شاعری کا خمیر تیار کیا ان میں فراق یگانہ اور شاد عارفی کے نام کافی نمایاں ہیں۔فراق اپنی شاعری میں نئے موضوعات، نئے آہنگ کے ساتھ ساتھ اسلوب کی سطح پر بھی جدت پسند تھے۔انہوں نے ہندو فلسفہ اور ہندو دیو مالا کو اپنی شاعری میں خوبصورتی سے پرو کر غزل کی ایرانی تہذیب میں ہندوستانی فکر و فلسفہ کی خوبصورت آمیزش کی ہے۔فراق نے اپنی شاعری کے ذریعہ نئی نسل کے غزل گو شعرا کی ذہنی رہنمائی کی ہے۔ابوالکلام قاسمی کہتے ہیں کہ فراق نے نئی نسل کے لوگوں کی رجحان سازی کی ہے اس لیے فراق کو رجحان ساز شاعر قرار دینا کوئی مبالغہ نہیں ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ایک اوسط درجے کا شاعر بھی اپنے اسلوب، اپنے لب ولہجہ اور اپنے ڈکشن سے نئی نسل کے شاعروں کے لیے ایک مثال بن سکتا ہے۔فراق نے 1950 کے آس پاس شاعری کے منظر نامے پر نمودار ہونے والے شعرا کی ذہنی تربیت کی اور نئی نسل کے شعرا نے ان کے اسلوب کو اپنایا بھی۔خلیل الرحمن اعظمی، ناصر کاظمی اور احمد مشتاق جیسے شاعروں کے کلام میں فراق کی ذہنی تربیت اور ان کے اسلوب کا اثر صاف نظر آتا ہے۔فراق کا ایک شعر ہے:

تیرے پہلو میں کیوں ہوتا ہے محسوس
کہ تجھ سے دور ہوتا جا رہا ہوں (فراق)

اس شعر میں نئی زندگی کے تقاضے کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔غزل کی روایتی شاعری میں پہلو میں ہونا قرب کی علامت اور محبت کے استعارے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا جب کہ فراق پہلو میں ہو کر بھی دور ہونے کا اندیشہ ظاہر کر رہے ہیں ۔

ایسی راتیں بھی ہم پہ گزری ہیں
تیرے پہلو میں تیری یاد آئی
(خلیل الرحمٰن اعظمی)

پہلو میں ہونا عشق کی انتہا اور وصال کا نتیجہ ہوتا تھا مگر نئے اسلوب نے پہلو میں یاد آنے کے استعارے سے دوری کا احساس اور تنہائی کے خوف کا ایک پیکر تخلیق کیا ہے۔ابوالکلام قاسمی نے فراق کو عشق کی مختلف کیفیتوں اور عشق کے تجربوں کے بیان کا شاعر قرار دیا

ہے۔محمد حسن عسکری نے کہا ہے کہ فراق نے محبوب کو ایسی معروضی حیثیت دی ہے جو اردو شاعری میں پہلے اسے حاصل نہیں تھی۔انہوں نے محبوب کو عاشق کی ہستی سے الگ کر کے بھی دیکھا ہے،ان کا محبوب ایک کردار ہے اور اس کردار کی نفسیات بھی سیدھی سادی نہیں ہے،ایسی ہی پیچ در پیچ ہے جیسے عاشق کی نفسیات۔یہ بات سچ ہے کہ فراق نے محبوب کی آزاد ہستی کی ترجمانی کی لیکن فراق کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے عشق کی مختلف کیفیات کو اور عشق کے غیر رسمی ارتعاشات کو بھی حسی پیکروں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

> "بیسویں صدی کے معاشرے نے احساس کے جن نئے گوشوں کا اضافہ کیا ہے ان کی جھلک فراق کے اشعار میں ضرور دیکھی جاسکتی ہے۔اگر آپ شعروں میں فراق کے لہجے کا تعین کریں تو پتا چلتا ہے کہ وہ اپنا لہجہ استفہامیہ رکھتے ہیں اور یہ استفہام بھی خود کلامی کا انداز لیے ہوئے ہے"۔(شاعری کی تنقید ص:83)

فراق نے اپنی شاعری میں عشق کی مختلف کیفیات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر نقاد نے فراق کی شاعری میں بہت سارے سقم کی نشاندہی کے باوجود ان کی شاعری کی تعریف کی ہے۔محمد حسن عسکری فراق کے مداحوں میں شمار ہوتے ہیں۔عقیل احمد نے بھی فراق کی شاعری کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے۔فراق کا اسطور قائم کرنے میں نیاز فتح پوری کا نہایت اہم رول رہا ہے۔انہوں نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا''یوپی کا ایک نوجوان ہندو شاعر فراق گورکھپوری'' جس میں انہوں نے فراق کی شاعری میں دلکشی،معنی آفرینی اور کیفیت کی نشاندہی کی تھی۔یہ مضمون 1937 میں شائع ہوا تھا۔فراق کا اسطور قائم کرنے میں یہ مضمون سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔شمس الرحمن فاروقی نے نیاز فتح پوری کے مضمون کے عنوان کی ہی سخت گرفت کی ہے۔انہوں نے لکھا ہے کہ جب نیاز فتح پوری فراق کو نوجوان شاعر کے لقب سے نواز رہے تھے،اس وقت فراق کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی۔اسی عمر میں میرؔ نے اپنا پہلا دیوان مرتب کر لیا تھا۔غالب نے اپنی مشہور غزلیں چوبیس برس کی عمر میں کہہ لیا تھا۔کیٹس(keats) شیلی(shelly) بالترتیب پچیس برس اور انتیس برس کی عمر میں فوت کر گئے۔ان نوجوان شاعروں میں لہجے کے انوکھے پن اور اسلوب کی جدت کی وجہ سے جو پختگی نظر آتی ہے فراق کی چالیس سالہ نوجوانی کی شاعری میں وہ پختگی نظر نہیں آتی۔شمس الرحمن فاروقی آل احمد سرور کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فراق کی شاعری میں ان کی آخری زندگی تک پختگی نہیں آسکی۔ان کے اسلوب کا تعین اس لیے بھی مشکل ہے کہ فراق نے اپنا کوئی اسلوب متعین نہیں کیا بلکہ وہ ہوا کی طرح بہتے گئے جب کہ میرؔ کے پہلے دیوان میں جو پختگی نظر آتی ہے اور ان کا جو لہجہ متعین ہوتا ہے وہ ان کے چھٹے دیوان میں بھی نظر آتا ہے۔یعنی میر نے شاعرانہ پختگی اور اسلوب کی ندرت جو اپنی اوائل عمر میں حاصل کر لیا تھا فراق آخری عمر تک بھی وہ پختگی نہ پاسکے اور نہ ہی اسلوب میں اپنی انفرادیت حاصل کر سکے۔شمس الرحمن فاروقی نے فراق کو اردو غزل کی روایت سے انجان بتایا ہے جب کہ ابوالکلام قاسمی نے فراق کی شاعری اور غزل گوئی کو اردو غزل کی روایت کی توسیع اور تسلسل قرار دیا ہے۔ابوالکلام قاسمی کہتے ہیں کہ فراق نے غزل کی روایت کی پاسداری کی ہے مگر روایت میں انہوں نے جدید فکر کو شامل بھی کیا ہے اس لیے فراق کے یہاں روایتوں کی تقلید نہیں بلکہ احترام کا جذبہ نظر آتا ہے۔فراق کی شاعری میں ہندوستانی عناصر کی شمولیت اور ہندو دیو مالا کو اردو کا غزلیہ آہنگ دینے کی بات بھی متواتر دہرائی جاتی ہے حالاں کہ شمس الرحمن فاروقی نے اس بات کا انکار کیا ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ فراق کی شاعری کی دوسری صنف کے لیے ہندوستانی عناصر کی شمولیت کی بات کی جائے تو ہوسکتا ہے کہ ان کی رباعیوں میں اس کی نشاندہی کی جاسکتی ہو مگر غزل میں ہندو دیو مالا اور ہندو فلسفے کی شمولیت سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس طرح کے مضامین غالب کی شاعری میں بھی ملتے ہیں جب کہ ابوالکلام قاسمی فراق کی شاعری میں ہند اسلامی کلچر کی

نشاندہی بھی کرتے ہیں اور فراق کی شاعری میں ہندوستانی عناصر پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ ان کی لفظیات کس حد تک ان کی شاعری کے مزاج کو ہندوستانی ثابت کرتی ہے تو اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ انہوں نے سیاق وسباق سے اپنے لفظوں کا مزاج متعین کرنے اور بعض مشتقات بنانے میں ہندی سے خاصا استفادہ کیا ہے۔ الفاظ کے استعمال سے ہندوستانیت یا ہندو دیومالا کا تاثر قائم کرنے کا عمل قدیم شعرا کی غزلوں میں بھی ملتا ہے مگر اس سلسلے میں فراق کا امتیاز یہ ہے کہ وہ محض لفظ یا اس کے مشتقات تک ہی خود کو محدود نہیں رکھتے بلکہ کبھی کبھی وہ ایسے حسی پیکر تراشتے ہیں جس کے پہلے حصے سے ایک طرف اسلامی روایت کا پس منظر ابھرتا ہے تو دوسری طرف ہندو دیومالا یا اجتماعی حافظہ پیکر کے کسی دوسرے حسی پیکر کو متحرک کر دیتا ہے ان کا شعر ہے:

سکوت توڑ کہ قم کی صدا ہے تیری صدا
نظر اٹھا کہ ان آنکھوں کا رس ہے سنجیون

یا اسی طرح ان کی غزلوں میں جگہ جگہ ایسے اشعار ملتے ہیں جن کی فضا یا جن کا کوئی نہ کوئی پہلو مقامی سرزمین اور ہندی زبان کی روح سے مربوط اور اس سے کسب فیض حاصل کرتا معلوم ہوتا ہے"۔ (شاعری کی تنقید ص:86)

یہ سچ ہے کہ فراق نے اپنی شاعری میں ہندی الفاظ کا استعمال کیا ہے اور ان کی غزل میں ہندی اور ہندوستانی عناصر کی منظر کشی ہوئی ہے جیسے ان کا ایک شعر ہے:

چپکے چپکے اٹھ رہا ہے مدھ بھرے سینوں میں درد
دھیمے دھیمے چل رہی ہے عشق کی پروائیاں

فراق نے ہندی الفاظ کو خوبصورتی سے برتا بھی ہے مگر قاسمی صاحب نے ہند اسلامی کلچر کی نمائندگی کرنے والے جس شعر کو نقل کیا ہے یا وہ شعر جس میں عربی کا ایک لفظ استعمال ہوا ہے اور اس کی بنیاد پر فراق کو ہند اسلامی کلچر کا ترجمان یا عکاسی کرنے والا شاعر بتایا ہے وہ دراصل دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابوالکلام قاسمی نے اس نوع کا کوئی دوسرا شعر نقل نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہند اسلامی کلچر کی عکاسی کے لیے اسلامی تاریخ سے جس قدر واقفیت ہونی چاہیے اور عربی وفارسی زبان پر جس قدر گرفت ہونی چاہیے یہ دونوں باتیں فراق کے یہاں مفقود تھی بلکہ فراق کی معلومات فارسی میں بالکل سطحی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فراق کی شاعری میں فارسیت نہیں ملتی اور جہاں کہیں انہوں نے بتکلف فارسی استعمال کرنا چاہا اس کا مناسب استعمال نہ کر سکے اور فارسی سے گہری واقفیت کے بغیر اسلامی کلچر کی ترجمانی ممکن نہیں ہے۔ فراق کی شاعری میں فارسیت کی کمی کی شکایت ایک بار رشید احمد صدیقی نے بھی کی تھی جس پر فاروقی صاحب نے کہا تھا کہ رشید احمد صدیقی نے فراق کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔ فاروقی صاحب کہتے ہیں کہ فراق فارسی الفاظ کے معنی ومفاہیم سے تو باخبر تھے مگر اس لفظ کی خاصیت اور اس کے مزاج سے ناواقف تھے جس کی وجہ سے وہ فارسی کے الفاظ کو پوری توانائی سے برتنے میں ناکام رہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

''فراق صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ وہ فارسی کے الفاظ اور اس کے لغوی معنی تو اکثر جانتے تھے لیکن ان کی روح اور مزاج سے بے خبر تھے اس لیے انہوں نے فارسی عربی الفاظ کو اس طرح برتا کہ وہ شعر میں اپنا پورا فائدہ نہیں دیتے اور کبھی کبھی تو اس طرح برتا کہ

زبان کا مزاج اس کو کبھی قبول نہیں کر سکا۔ 'جلوہ' کا استعمال ان کے یہاں 'دیکھو ہؤ والی غزل کے ایک شعر میں ہے، یہاں یہ لفظ شعر کا حسن بڑھانے کے بجائے مفہوم کو خبط کر رہا ہے ؎

کبھی بنا دو ہو سینے کو جلوؤں سے رشک گلزار
کبھی رنگ رخ بن کر تم یاد آتے ہی اڑ جاؤ ہو
زہے آب گل کی یہ کیمیا ہے چمن کے معجزہ نمو
خزاں ہے کچھ نہ بہار کچھ وہی خار وخس وہی رنگ وبو
میری شاعری کا یہ آئینہ کرے ایسے کو تیرے روبرو
جو تیری ہی طرح ہو سر بسر جو تجھ ہی سے ملتا ہو ہو بہو
وہ چمن پرست بھی ہیں جنہیں یہ خبر ہوئی ہی نہ آج تک
کہ گلوں کی جس سے ہے پرورش رگ خار میں ہے وہی لہو

ان اشعار میں کیمیا، رنگ وبو، سر بسر، سوز، رنگ نشاط ایسے الفاظ اور فقرے ہیں جو یا تو پوری طرح کارگر نہیں ہے مثلاً "رنگ و بو" کیوں کہ اس میں اور "خار وخس" میں مناسبت نہیں ہے اور "سر بسر" کیوں کہ "مو بہ مو" جیسے خوبصورت فقرے کے سامنے 'سر بلند' نہیں ہو سکتا؛ "کیمیا" جس کا تعلق نمود سے تو ہو سکتا ہے نمو سے نہیں اور ''سوز وساز'' جس کا بہار سے اور غم کی بو آنے سے کوئی تعلق نہیں۔ (فراق شاعر اور شخص، شمیم حنفی، مصطفی بک ٹریڈر لاہور 1983 ص:64)

اس اقتباس میں فاروقی صاحب اپنے مخصوص وضاحتی انداز میں فراق کی فارسی الفاظ کے مزاج اور کیفیت سے عدم واقفیت کا اظہار کر چکے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو غزل کی روایت میں جو چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے یعنی فارسی اس سے فراق بہرہ مند نہیں تھے تو پھر ہند اسلامی کلچر کی ترجمانی کی بات ہی فارسی سے عدم واقفیت کی بنا پر ختم ہو جاتی ہے کہ ہند اسلامی کلچر کا خمیر ہی عربی و فارسی سے اٹھتا ہے۔ البتہ قاسمی صاحب کی یہ بات درست ہے کہ فراق نے ہندو تہذیب اور ہندوستانی عناصر کو خوبصورتی سے اردو کے غزلیہ آہنگ میں ڈھالا ہے۔ حالاں کہ دوسرے شعرا نے بھی ہندو تہذیب وثقافت کو اپنی شاعری میں شامل کیا ہے مگر فراق اس معنی میں اہم ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے الفاظ سے تمام مناظر کو ہندوستانی رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ فراق نے میرؔ کے طرز میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ میر کا انداز تو نصیب نہیں ہوا مگر ان اشعار میں سوز وگداز اور حلاوت کی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ فاروقی صاحب نے صحیح کہا ہے کہ فراق جذبہ و وجدان اور قلبی کیفیت کے شاعر نہیں ہیں وہ عامۃ الناس کے شاعر ہیں کیوں کہ وہ عشق کی مختلف کیفیت کا ذکر تو کرتے ہیں مگر اس میں حرارت اور تخلیقی تجربے کی تپش کی کمی کے ساتھ ساتھ جذبے کی صداقت کا فقدان بھی نظر آتا ہے۔ وہ لفظوں کے توازن اور صنعتوں کا خوبصورتی سے استعمال کرنے والے شاعر ہیں مگر پھر بھی انہوں نے ایک رجحان دیا ہے اور ایک راہ بتائی ہے جس کی پیروی ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی اور احمد مشتاق جیسے شاعروں نے کر کے اردو غزل کو جدید پیرہن عطا کیا۔

قسط ۳

مدھوبنی کا قلمی سفر: زبان وادب کے حوالے سے

ڈاکٹر عمر فاروق قاسمی
استاد ودیا پتی پلس ٹو ہائی اسکول
بسفی مدھوبنی 9525755126

مدھوبنی کا قلمی سفر قسط اول اور دوم کی اشاعت کے بعد کچھ احباب نے یہ نشاندہی کی کہ آپ کا یہ تخیلاتی سفر ''اسلوب بیان کی ندرت'' کے باوجود کئی اہم شخصیات کے تذکرے سے خالی ہے۔ احباب کے انتباہ کے بعد ہی یہ ارادہ بنا کہ تخیلاتی سفر کے اس قافلہ کو ان علاقوں میں دوبارہ آمادۂ سفر کیا جائے اور ان بستیوں کی بھی زیارت کی جائے جن کو اس وقت لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا تھا یا جہاں کے چھپے ہوئے ''نایاب موتیوں'' تک مسافر علم راہ یاب نہیں ہو سکا تھا۔ اس قسط میں انھی ''نایاب گوہروں'' تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ؛تو چلتا ہوں سب سے پہلے اپنے اجداد کی بستی دملہ سے تقریباً چار کیلومیٹر دور پتونا کی سرزمین پر، وجہ کوئی بھی ہوا پنے پچھلے تخیلاتی سفر میں ''پروہی'' سے گزرنے کے باوجود پتونا کے کسی بھی گوہر نایاب کو دریافت نہ کر سکا اور کسی کو یہ شکایت کا موقع مل گیا کہ ''قبرستان ہی کی روداد چل رہی ہے یا زندوں کی بھی، چندرسین پور کی قبرستان سے پروہی قبرستان پھر دملہ؟'' دراصل روداد نہ مُردوں کی تھی نہ زندوں کی روداد تو اصحابِ قلم اور انشا پردازوں کی چل رہی تھی اور نہ یہاں کے کسی سلف کی انشا پردازی کا کوئی نمونہ میرے سامنے تھا اور نہ ہی کسی خلف کا۔ ویسے بھی یہیں میرا تھانہ بھی ہے اور تھانے کے ماحول میں ابتدائی پرورش و پرداخت کے باوجود اس دنیا سے نہ میری شناسائی ہے اور نہ میرا آنا جانا ہے کیوں کہ تھانے کوئی بھی ہوں ان سے ایک قسم کی وحشت محسوس ہوتی ہے اور وحشت ہو یا دہشت اس کے قریب جانا کون چاہتا ہے؟

خیر! تو پہنچیے پتونا اور پتہ لگائیے یہاں کے پیڑ پودوں کا جن کی نرم نازک شاخوں اور پتیوں پر کئی پھول کھلے ہوئے ملیں گے جو اپنی خوشبوؤں سے اطراف واکناف کو مہکائے ہوئے ہیں۔ انھی پھولوں میں ایک ہیں مولانا ڈاکٹر محمد عالم قاسمی صاحب: موصوف آل انڈیا ملی کونسل کے جنرل سکریٹری ہیں اور تنظیم ائمہ مساجد بہار کے سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں، رفاہی اور سماجی امور سے دلچسپی کے ساتھ قلم وقرطاس سے بھی رشتہ بنائے رکھا ہے؛ "نقوش تابندہ"، "یاد مجتبی"، "تصوف کا ایک اجمالی جائزہ"، "پٹنہ کی مشہور مساجد"، "حیات مولانا بشارت کریم"، "دریچۂ دل" (آپ بیتی)، "ہمارا پیارا دین اسلام"، (اول تا ششم) "جدید آئینہ فارسی"، "دائمی نظام الاوقات''، "جدید آسان قواعد اردو اینڈ کمپوزیشن" (اول دوم پنجم) اور متاع دین ان کی تصنیفی وتالیفی دل چسپی کی گواہ ہیں۔

اسی گاؤں سے تعلق رکھنے والے مولانا رضوان قاسمی ہیں، درجہ اعدادیہ میں مدرسہ اسلامیہ محمودالعلوم دملہ میں میرے ہم درس رہے ہیں، طبیہ کالج پٹنہ سے بی یو ایم ایس کرنے کے بعد دربھنگہ میں اپنا مطب چلاتے ہیں۔ حیات مجاہد جلد اول اور دوم کے مؤلف ہیں قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ سابق صدر مسلم پرسنل لا بورڈ کی تقریروں کو انھوں نے جمع کیا ہے۔

پتونا سے تقریباً ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر شمال کی طرف ایک بستی ہے اسراہی، آگے بڑھنے سے پہلے ذرا یہاں بھی رک جائیے۔ ذرا ملتے جائیے ریاست بہار کے مشہور و معروف عالم دین جناب مولانا شبلی قاسمی صاحب سے، مولانا موصوف تقریباً آٹھ دس سالوں سے امارت شرعیہ کے قائم مقام ناظم رہے ہیں، امیر شریعت سابع مولانا سید ولی رحمانی کے معتمد خاص بھی تھے اور اپنی خداداد صلاحیت سے امارت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار نبھاتے رہے ہیں، ادھر چند مہینوں پہلے امارت شرعیہ ٹرسٹیز گروپ نے انھیں ناظم امارت شرعیہ نامزد کیا ہے۔ عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ایک مدرسہ ''اینگلو عربک اکیڈمی'' کے نام سے پھلواری شریف میں قائم کیا ہے۔ دینی و دنیوی دونوں مطالبات کی تکمیل کی طرف گامزن یہ ادارہ ایک بہترین تجربہ ہے۔ خالق کائنات اس تجربے کو ثمر آور بنائے۔ شمشاد میموریل اکیڈمی کے نام سے اسراہی میں ایک اسکول بھی قائم کیا ہے۔ علم و ادب کی الماریوں میں ان کی بھی کئی کتابیں دعوت مطالعہ دیتی ہیں۔ ''منزل کا سراغ''، ''عہد جاوداں''، ''نظام اوقاف''، ''مدارس اسلامیہ''، ''سرو درفتہ''، ''مدینے کے مقدس مقامات حج و عمرہ کا آسان طریقہ''، ''جمعہ اور عیدین کے احکام'' ان کی تصنیفی و تالیفی خدمات کے گواہ ہیں۔ خدا پھر سے انھیں دنیائے تحریر کے لیے آمادۂ سفر کردے۔

اسراہی سے نکل کر پرسونی ہوتے ہوئے میرے تخیلات کی سواری گنور میں رک جاتی ہے۔ یہاں میری ملاقات عزیز دوست ڈاکٹر حسان جاذب سے ہوتی ہے، آزاد اور معرّیٰ شاعری غالب کی طرح میری سمجھ سے بھی بالاتر رہی ہے اور انھیں آزاد شاعری سے کافی لگاؤ تھا اس لیے ان کی شاعری کو سرسری طور پر دیکھ کر ہی گزرنے کی عادت رہی ہے بلکہ غالب ہی کی طرح ''جدید شعرا کی مجلس'' سے بھاگ جانے ہی میں عافیت محسوس کی ہے اور رہی بات ان کی پابند شاعری تو اس میں بھی زیادہ تر تعقید معنوی ہی نظر آتی تھی میری کوتاہ فہمی جن کو سمجھنے سے قاصر رہی ہے لیکن ادھر چند مہینوں سے ان میں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں اور ایسے اشعار سامنے آئے ہیں جو مجھ جیسے ''ناسمجھ'' لوگوں کی نظر میں بھی بہتر و لائق تحسین ہے اور خیالات کی دنیا کو اپیل بھی کرتی ہے۔ ملی تنظیموں کے درمیان اقتدار کی چپقلش کو سامنے رکھئے اور یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

اِدھر والا بھی ہے ناخوش اُدھر والا بھی نالاں ہے
نہ یہ مخلص ہے لوگوں سے نہ ان میں ہی شرافت ہے
مفادِ خاص میں امت کو بانٹا ہے گروہوں میں
نہ یہ سالارِ ملت ہے نہ وہ پیرِ طریقت ہے

اور سیاسی و مذہبی قائدین پر ان کا یہ طنز بھی دیکھئے۔

رفتہ رفتہ دن بدن سارے بھکاری ہو گئے

رہنما جن کو چنا تھا وہ مداری ہو گئے
حکم سرکاری کے آگے اس طرح سے جھک گئے
لوگوں کو مومن بنا کر خود پجاری ہو گئے

اور یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے کہ۔

شاہوں کے درمیان غلامی میں جینے سے
بہتر ہے یہ فقیروں میں عزت سے تم جیو
جھوٹا کسی کا گرچہ ہو آبِ حیات ہی
جینا ہے گر وقار سے ہرگز نہیں پیو

آیئے! ایک دوسرے شاعر سے یہ قطعہ ملاحظہ کریں۔

محبت کا دریا ابلتا ہے جس پر
مری عمر گذری ہے اس سرزمیں پر
کھٹونا کی بستی وہ شہر وفا ہے
شرافت کا جھومر ہے جس کی جبیں پر

تو آیئے دریائے محبت جس سرزمین پر ابلتا ہے جسے شاعر نے شہر وفا کہا ہے جس کی پیشانی پر شرافت کا جھومر لٹک رہا ہے کچھ دیر وہاں رک ہی جایئے اور اس کے دریائے محبت سے کچھ گھونٹ پی کر ہی آگے بڑھیے۔تو باندھ دیجیے اپنے قافلے کی اس سواری کو ''کھونٹا باندھنے کی اِس جگہ'' پر۔یعنی کھٹونا کی اس سرزمین پر نام ونمود سے دور پروفیسر عبدالقدوس فہمی سے ملیے۔دنیائے حقیقت میں نہ سہی، تصوراتی کائنات ہی میں سہی ذرا زیارت کر لیجئے ان کی بھی جن کے نوک قلم نے مذکورہ بالا اشعار اگلے ہیں۔تو چلیے ملتے ہیں ان کے اشہب قلم سے نکلے ہوئے ''جواہر پاروں'' سے۔''تفہیم اقبال''، ''آئینہ اقبالیات''، ''سر محمد اقبال''، ''نشاط ارم'' (نعتوں کا مجموعہ)، آئینہ گل (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ)، ''انداز گل'' (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ)، ''اقبال کا فنی وتنقیدی جائزہ''، ''اقبال کی پندرہ نظموں کا تجزیاتی مطالعہ''، ''اردو غزل گو''، ''مثنوی کا باغ و بہار''، ''ضوپائے کائنات'' (نعتوں کا مجموعہ)، ''سخن دان اردو'' (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)؛ یہ سب قرطاس وقلم کی دنیا میں وہ شاہکار ہیں جو ان کی شخصیت کو صفت لازوال عطا کرتے ہیں۔شاعری میں چاہے صنف غزل ہو یا نظم ہر جہت سے انھوں نے آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔سیاست کی داغ دار پیشانیاں بھی ان کی شاعری کا موضوع بنی ہیں تو سماج کے مکروہ اور ناپسندیدہ چہرے بھی ان کے قرطاس ابیض کے آئینے میں نظر آتے ہیں۔نفرت زدہ معاشرے میں محبت کا چراغ کس طرح روشن کرنے کی انھوں نے کوشش کی ہے؟ ملاحظہ کیجیے ان کی غزل کے یہ اشعار۔

نفرتوں کی آندھیاں سب کچھ اڑا لے جائیں گے
چار دن کی زندگی ہے پیار کی باتیں کرو

خندۂ انکار سے ہوتی ہے توہینِ وفا
عشق کے ماحول میں اقرار کی باتیں کرو

تقریباً سبھی شعرانے عورت کی اہمیت کواجاگر کیا ہے اوراسے خلاصۂ کائنات بنا کر پیش کیا ہے۔قدوس فہمی نے بھی جہاں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس دنیا میں ہر کامیاب مرد کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے وہیں انہوں نے گلشنِ روزگار میں عورت کو باغ جنت کی حور قرار دیا ہے۔ملاحظہ ہو نظم عورت کے یہ اشعار۔

حاصلِ رنگ ونور ہے عورت
زندگی کا سرور ہے عورت
گلشن روزگار میں فہمی
باغ جنت کی حور ہے عورت

حالات حاضرہ میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور زمانے میں اس قدر انقلاب آئے کہ خوبیوں اور خامیوں کے معیار بدل گئے،کل جوخوبیاں تھیں آج خامیوں میں بدل گئے ہیں اور جن کا شمار نقائص میں ہوتا تھا آج وہ محاسن کی فہرست میں ہیں۔ظلمت روشنی کومنہ چڑاتی ہے اور جہالت علم کو، برائیاں نیکیوں کا مذاق اڑاتی ہیں اور ذلت عزت کا۔اس حوالے سے ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

•••

آیا انقلاب کی قدریں بدل گئیں
اہل وفا سے اہل ستم کو گلا ہوا

اور یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے۔

بے ارادہ نظر ان سے ٹکرا گئی
زندگی میں اچانک بہار آگئی
رخ سے پردہ ہٹا چاندنی کھل اٹھی
زلف بکھری تو کالی گھٹا چھا گئی
اس نے انگڑائی لی آسماں جھوم اٹھا
اس کی نظریں جھکیں رات شرما گئی

نفرتوں کے سوداگر کے حوالے سے ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

وہ شہر جس کی گلیوں میں ہو نفرتوں کی آگ
آباد کون ہوگا؟ وہاں گھر خرید کر

صحرا میں جس کو پھول کھلانے کا شوق ہو
لے جائے آنسوؤں کا سمندر خرید کر

اردو تہذیب وشائستگی کی پہچان ہے، کم پڑھے لکھے انسان کو بھی وہ سلیقہ عطا کرتی ہے کہ لوگوں کے درمیان وہ قابلیت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اردو کا یہی وہ قرض ہے جس کی وجہ سے سبھی شعراء نے اس کی ثناخوانی کو اپنا فرض سمجھا ہے۔ فہمی نے بھی اپنی ایک نظم کے ذریعے اس قرض کو اتارنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے اس نظم کے یہ چند اشعار ۔

حسن ادراک کی تازہ کاری ہے جو
داستانِ حقیقت نگاری ہے جو
وہ ہے اردو زباں وہ ہے اردو زباں
جس کے دامن میں ہے گلشن رنگ و بو
جس کی رگ رگ میں پنہاں ہے دل کا لہو
جس کے در سے ملی دولت آبرو
جس کے اوصاف کی دھوم ہے چار سو
وہ ہے اردو زباں وہ ہے اردو زباں

فہمی کی غزلوں میں صرف لب ورخسار اور لہراتی ہوئی زلفوں کی باتیں نہیں ہیں بلکہ زندگی کے سنجیدہ مسائل کو بھی ان کی غزلیں اپنا موضوع بناتی ہیں۔ مسلمانوں کے حوالے سے بھی انھوں نے جو گفتگو کی ہے اس میں بھی انھوں نے مردمومن کی صفات میں کردار ہی کو اہم قرار دیا ہے ۔

عصر حاضر کو ہے فہمی مردمومن کی تلاش
راہ حق میں جو ہر کردار کی باتیں کرو

کھٹونا سے واپسی پر چلیے اب چلتے ہیں یاری ودوستی کی سرزمین دوست پور۔ یہاں ہماری ملاقات ہوتی ہے ستر سال کے ایک ''نوجوان'' شاعر کلیم اللہ کلیم صاحب سے۔

دامن بھرا ہے جس نے زبان وادب کا یوں
کس درجہ سرفروش ہے ستر کا نوجوان

ان کی شاعری کے دو مجموعے گلدستہ کلیم اور سخن ہائے کلیم منظر عام پر آچکے ہیں ۔

•••

چلو مل لیں ذرا ان سے کہ مجھ سے کیا شکایت ہے
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں مروت آ ہی جاتی ہے

یہ دنیا قید خانہ ہے یہاں بچ بچ کے چلنا ہے
ہوئے جو منہمک اس میں ذلالت ہو ہی جاتی ہے

کلیم اللہ صاحب ایک فعال اور نیک صفت انسان ہیں۔ دین و دنیا دونوں ہی ان کا میدان عمل ہے جہاں انھوں نے اردو زبان کی زلفوں کو سنوارنے میں اپنی زندگی کے بیش قیمتی اوقات صرف کیے ہیں وہیں تبلیغی جماعت میں سرگرمِ عمل رہ کر اپنی اور اپنے ساتھ دوسروں کی آخرت سنوارنے میں بھی پسینے بہائے ہیں۔ اردو زبان کے حوالے سے ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے ۔

اردو زباں ہے ایسی گھر گھر بسی ہے یارو
شیریں زباں ہے اردو سب کو ذرا سنادو

کلیم صاحب نے طبیعت بہت حساس پائی ہے، دل بھی بہت گداز ہے اور خیالات بھی بڑے پاکیزہ ہیں، بے حد شریف اور منکسر المزاج آدمی ہیں۔ ان کی آبائی بستی کا نام دوست پور ہے تو واقعی دوستی بھی ان کی فطرت میں رچ بس گئی ہے۔ اردو کے بہت ہی مخلص دوست رہے ہیں اسی لیے انھوں نے اردو کے شعراء ادبا اور صحافیوں کو ''کلیم اللہ کلیم ایوارڈ'' دینے کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا تھا اور جیب خاص سے فیاضی بھی کرتے تھے۔ معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ اب بھی قائم ہے یا نہیں لیکن بہر کیف یہ ایک تقلیدی عمل تھا۔ ان کی نظم ''ماں کی موت پر ایک تاثر'' عمدہ نظم کہی جاتی ہے جس میں ماں کے حوالے سے ان کے جذبات کی عمدہ عکاسی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ''زندگی''، ''نماز''، ''وصیت نامہ'' عمدہ اور مؤثر نظمیں ہیں جن میں وہ دنیا کی بے ثباتی کو بہت ہی اثر انگیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ خوف خدا اور خشیت خداوندی کے ساتھ ساتھ دنیا سے بے رغبتی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے یہ عمدہ نظموں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان کی شاعری میں لایعنیات جھوٹ شرک و بدعات فحاشی و عریانیت اور غیر اسلامی نظریات کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔ ان کے ذہنی اٹھان اور فکر و فن دونوں میں مذہبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے تبلیغ دین کے حوالے سے ملکی اور غیر ملکی دوروں نے ان کے مزاج کو اسلامی افکار و خیالات سے اور زیادہ مجلّٰی کر دیا ہے۔ چہرے پر سنت رسول کی پاسداری سے ان کے مذہبی رجحان کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پارسائی کی یہ علامت دین کے راستے سے دنیا کمانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اپنی زندگی کو عملی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ہے، حلقہ یاراں ہو یا مجلسِ اغیار، زاہدانِ خشک کی بیٹھک ہو یا سخنورانِ ترخیال کی بزم، مؤذن کی آذاں انھیں نماز کی ادائیگی کے لیے آرائش محفل کو چھوڑ دینے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ان کے خیال میں اذان کے بعد ''سارے گھروں کے دروازے بند ہو جانے چاہیے اور صرف ایک دروازہ کھلا رہنا چاہیے'' اور وہ ہے دروازۂ خانۂ خدا یعنی مسجد۔ ملاحظہ کیجیے ان کا یہ شعر ۔

رنگ محفل ہو جہاں تو شاعری کو چھوڑ کر
وقت اذاں آجایئے مصلی بچھاتے جایئے

غالب نے کہا ہے کہ ۔

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

اسی سے ملتا جلتا کلیم کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے ۔

عشق نے آخر مجھ کو رسوا کر دیا
یہ دل کا سودا تھا خسارے میں رہا

ان کے غزلیہ اشعار میں تغزل کا یہ رنگ ملاحظہ کیجیے۔

تجھے کیا بتاؤں میں حال دل کیا کشش ہے تیرے جمال میں
تو حسین و جمیل ہے اس قدر کسے لاؤں تیری مثال میں
تو ہے شادماں میں ہوں غم زدہ تجھے فکر کیوں ہو کلیم کا
میری داستان الم ہے یہ کٹی عمر رنج و ملال میں

شاعری کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

"یہ کیا کم ہے کہ شاعری زندگی میں فرحت و تازگی عطا کرتی ہے روح کو بیدار کرتی ہے مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے سوتے ہوئے احساس کو جگاتی ہے حوصلہ بڑھاتی ہے اور بلندی عطا کرتی ہے دلوں میں جوش وخروش پیدا کرتی ہے اور اصول وضوابط کے مطابق زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی سکھاتی ہے"۔

دوست پور سے کلوا،ہی ہوتے ہوئے چلتے ہیں پرسولیا۔ یہاں ہماری ملاقات ہوتی ہے صدر عالم گوہر صاحب سے، گوہر صاحب واقعی دنیائے ادب کے گوہر نایاب ہی۔ "چاندنی خیالوں کی" (شعری مجموعہ اردو)، "گونو جھا کے قصے اور دوسری کہانیاں"، "پتھروں کے شہر میں" (شعری مجموعہ ہندی رسم الخط میں)، "جیہہ دیکھو سیہہ باجو" (شعری مجموعہ میتھلی زبان میں)، "پس آئینہ کوئی اور ہے" (فلمی مضامین)، "مضامین صدر عالم گوہر"، "میتھلی بھاشا پر اردو بھاشا کا پربھاؤ"، "اردو زبان کے اثرات میتھلی زبان پر"، "اردو زبان کے اثرات مراٹھی زبان پر"، "اردو زبان کے اثرات ہندوستانی فلمی موسیقی پر"، "اردو زبان کے اثرات گجراتی زبان پر" اس کے علاوہ ان کے چار تراجم بھی ہیں جو مختلف زبانوں سے مختلف زبانوں میں کیے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف شخصیات کا لیا ہوا انٹرویو 'روبرو' کے نام سے ہے جس میں معروف موسیقار لکشمی کانت، گلوکار محمد عزیز، کمار سانو، گلوکارہ مبارک بیگم، معروف نغمہ نگار ندا فاضلی، نقش لائل پوری وغیرہ کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سارے ایوارڈ بھی انھوں نے اپنے نام کیے ہیں۔ چند اشعار سے ان کے شعری خیالات کو اچھی طرح سے سمجھا جا سکتا ہے۔

بہتر ہے بھول جائیں جتنے گلے ہیں کل کے
آجاؤ پھر سے دیکھیں ہم ساتھ ساتھ چل کے
ہر فاصلہ مٹے گا ہوں گے قریب پھر ہم
دیکھیں جو سوچنے کے انداز کچھ بدل کے
بے چین تیری آنکھیں میرا سکوں بھی کھویا
کچھ خواب ہی سجائیں آؤ سنہرے کل کے

اور ہندوستان کی موجودہ صورت حال پر انھوں نے کس خوبصورتی کے ساتھ طنز کیا ہے ملاحظہ کیجیے ۔

سکون ایک پل بھی میسر نہیں ہے
یہاں کوئی محفوظ اب گھر نہیں ہے
کھلے عام پھرتے ہیں قاتل نگر میں
میں کیسے کہوں کہ مجھے ڈر نہیں ہے

تخیلاتی سفر کے دوران جن بستیوں سے ملاقات رہ گئی تھی ان میں نیپال کی ترائی سے متصل ''بسہا'' نامی بستی بھی ہے جو بابو برہی بلاک میں واقع ہے۔ یہ بستی ہندو و مسلم قومی یکجہتی کی علامت کے طور پر جانی پہچانی جاتی ہے اور اخوت ومحبت وآپسی بھائی چارے کی نمایاں مثال پیش کرتی ہے۔ آیئے ملتے ہیں یہاں ''توضیحی فہرست ومخطوطات عربی وفارسی خدا بخش لائبریری پٹنہ، جلد ۳۴ کے معاون مرتب شہری زندگی برائے درجہ نہم ودہم، بہار ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن پٹنہ کے مترجم بھارتی بھون سے شائع گولڈن اگزامنیشن گائیڈ: اردو وفارسی کے مؤلف (۱۹۸۵ء تا ۲۰۰۱ء) مجلہ جشن صد سالہ محمڈن اینگلو عربک اسکول کے معاون مدیر مولانا محمد شفیع سے۔ غم کے ماروں کے سامنے لہجہ بدل بدل کے جنھوں نے غزل سرائی کی ہے انھی کا نام ہے شفیع الرحمن شفیع ۔

سناتے رہیے غزل مسلسل جہاں کو لہجہ بدل بدل کے
سرور افزا نوا سنیں گے غموں کے مارے مچل مچل کے

اور انھوں ہی نے یہ کہا تھا کہ ۔

بوئے گل مشکِ ختن لعلِ بدخشاں ہوں گے
میرے اشعار سے آباد گلستاں ہوں گے

تصنیفات وتالیفات کی دنیا میں انھوں نے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ انمٹ اور نا قابل فراموش ہیں۔ کائنات کی مقدس ترین اور حوادثات زمانہ کی خرد برد سے محفوظ کتاب قرآن کریم کی سورتوں کے منظوم تراجم نے انھیں زندگیِ لازوال بخشی ہے۔ عرق ریزی اور جانفشانی کے ساتھ ساتھ اپنے ذہنی اختراع کو بروئے کار لاتے ہوئے جس فنی بصیرت اور تخلیقی ہنرمندی کا ثبوت انھوں نے پیش کیا ہے وہ ان کو صفت دوام بخشنے کے لیے کافی ہے۔ سورۃ البقرہ، سورۃ آل عمران، سورۃ النساء، سورۃ المائدہ، سورۂ یاسین، سورۃ الرحمن اور اٹھائیسویں سے تیسویں پارہ تک انھوں نے بہت حد تک کامیابی اور ہنرمندی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ کاش وہ اشاعت کے مرحلے سے گذر کر قارئین کی نگاہوں کا سرمہ بن جاتا۔ ان کی شعری کائنات میں حمد، نعت، غزل، نظم، رباعی، قصیدہ، قطعہ اور دوہے سمیت مختلف اصناف سخن شامل ہیں۔ فارسی وانگریزی کے شاہکار ادب کے اردو تراجم بھی دل ودماغ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہیں۔ فارسی کے مشہور ومعروف شعراء مولانا جلال الدین رومی، حافظؔ شیرازی، شیخ سعدیؔ، امیر خسروؔ کے علاوہ مختلف شعرا کی فارسی تخلیقات کو بھی انھوں نے اردو شاعری کے زیور سے آراستہ کیا ہے۔ انگریزی شعرا بالخصوص شیکسپیئر کے سانیٹ، الیگزینڈر پوپ، جان ڈن، جان ڈرائیڈن، لانگ فیلو را، بندر ناتھ ٹیگور اور دیگر شعرا کی تخلیقات کو اردو کے منظوم ادبی شہ پاروں میں

ڈھالا ہے جن سے ان کی علمی گہرائی، فنکارانہ ہنرمندی کا پتہ چلتا ہے۔ جلوت کی جگہ خلوت اور بزم لوٹنے کی جگہ گوشہ نشینی کو ہی اپنی زندگی کا متاع بے بہا سمجھتے تھے اسی لیے انھیں وہ شہرت نہیں مل سکی جس کے وہ حقدار تھے۔ وہ بیک وقت پانچ زبانوں عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور ہندی پر ماہرانہ قدرت رکھتے تھے۔ ان کے حمدیہ ونعتیہ کلاموں اور چند غزلوں میں اس قدرت کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

خواہ مسائل ملکی ہوں یا عالمی، عصری تقاضے کے مختلف پہلوؤں کو انھوں نے اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلامی عقائد، قرآن وسنت، تاریخ وسیاست کے موضوع پر بھی اپنی شاعری کے گوہر لٹائے ہیں۔ آفاق وانفس میں موجود اللہ کی نشانیوں پر غزلیں، نظمیں، قطعات اور رباعیات جیسی اصناف تخلیق کر کے اپنے تخلیقی واختراعی کمال کو اجاگر کرتے ہوئے فنکارانہ ہنرمندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ "معجزاتی جھلکیاں" کے عنوان سے رسول ﷺ کے معجزات کو بھی شعری قالب میں ڈھالا ہے۔ کائنات میں مشاہدے کے حوالے سے ان کا یہ شعر کس قدر خوبصورت ہے ملاحظہ کیجئے۔

یہ مٹی کیا؟ ہوا کیا ہے؟ فضا کیا ہے؟ خلا کیا ہے؟
مشاہد اُن کے جو ہوتے سمجھ لیتے خدا کیا ہے؟

مولانا شفیع الرحمن شفیع چوں کہ عالم دین بھی تھے اس لیے ان کی شاعری میں زلف ورخسار وگیسوئے خمدار کی جگہ اخلاقی ماحول اور دینی فضا زیادہ ملتی ہے اور تغزل کے اشعار میں بھی عشق مجازی کی تان عشق حقیقی پر ہی جا کر ٹوٹتی ہے۔ ''آبشارِ نوا'' ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ہے جس میں آیاتِ قرآنیہ، احادیث نبویہ کے ٹکڑوں کا استعمال بڑی فنکاری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل اشعار کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنائیے اور تلمیحاتی انداز میں قرآنی آیات کی پیش کش کا خوبصورت نظارہ دیکھئے۔

•••

کہتے ہندی میں لوگ زن کو نار
فقنا ربنا عذاب النار
کس کو ملا ہے زندگی میں آج تک فراغ
''ھل من مزید'' کا ہی لگاتے سبھی سراغ
''ربنا اغفرلنا'' من العصیان
نرجع کلنا مع الایمان

•••

خواہشات اور ضبط نفس کے حوالے سے ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

ہزاروں خواہشوں کے دل میں جب چشمے ابلتے ہیں
مسرت بھاگ جاتی ہے جگر کے خون جلتے ہیں

یونیورسیٹیوں کے معیارِتعلیم کے حوالے سے ان کا یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے

لگیں اسناد بکنے جامعہ کی
یہ ملت مستند جاہل بھی ہوگی
تحقیق کسے کہتے دانش بھی تجارت ہے
جو بھی ہیں تراشے ہیں دزدیدہ مقالے ہیں

اور وطن دوستی پر ان کا یہ شعر بھی پڑھیے۔

شفیعؔ دشمن نہیں کسی کا نہ لب پہ شکوہ ہے بے بسی کا
وطن کی خاطر ہے جان حاضر دے اس کے دشمن کو رب ہدایت

مولانا شفیع الرحمان شفیعؔ کے کلام کو سمجھنے کے لیے قرآن وحدیث، نزولی پس منظر و شانِ ورود اور فقہ اسلامی کی دنیا سے واقفیت، سیرۃ النبی اور سیرت صحابہ کی وافر معلومات، تاریخ وتہذیب سے دل چسپی، معجزاتِ انبیا اور کراماتِ اولیا جیسے واقعات کی جانکاری بہت ضروری ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور اردو کے کلاسیکی شعرا وادبا کو بھی گہرائی کے ساتھ پڑھنا ضروری ہے، تبھی ان کے اشعار کی خوشبوؤں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں کیوں کہ ان کا یہ دعویٰ یوں نہیں ہے کہ۔

خوشبو ہے لفظ لفظ میں میرے بسی شفیعؔ
اشعار پھول پھول ہیں دل کے دیار کے

خوشبوؤں سے مزید معطر ہونے کے لیے اگر خواہش ہے تو مطالعہ کیجیے ڈاکٹر عبدالرافع صاحب کے مضمون ''مولانا شفیع الرحمان شفیعؔ: فکر وفن کے آئینے میں'' کا۔ موصوف نے بڑی محنت کے ساتھ اس پر کام کیا ہے، شفیعؔ کے حوالے سے راقم کی جو بھی خامہ فرسائی ہے انھی کے مضمون کی مدد سے ہے۔ لہٰذا اگر کسی قسم کا تکرار ملے تو معذرت۔

مدھوبنی کا یہ تخیلاتی سفر یہیں پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ تینوں قسطوں میں میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ضلع مدھوبنی کی علمی وادبی خدمات کے حوالے سے ان بستیوں کا ''تصدیقی'' یا ''تصوراتی'' سفر کروں جن کی مٹی سے پیدا ہونے والی شخصیات نے ملک یا بیرون ملک کسی بھی سرزمین میں رہ کر دنیائے تحریر میں اپنا نام روشن کیا ہے یا اسی ضلع کی کسی دھرتی پر رہ کر قلم وقرطاس کی شمع روشن کی ہے، چاہے وہ یہاں کے ہوں یا باہر کے لیکن دنیائے تحریر ہی نہیں علم وفن کے ہر میدان میں مستثنیات کو چھوڑ کر ''ھل من مزید'' کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس لیے قلم وقرطاس کی دنیا میں اگر کوئی شخصیت ''نقاب پوش'' رہ گئی ہے اور آپ کی رسائی وہاں تک ہو جائے تو نقاب کشائی کی زحمت گوارا کریں گے تاکہ ان کے بھی لب ورخسار، چشم وابرو، کردار وگفتار اور گیسوئے خمدار کے حوالے سے قلم کی نوک کو جنبش دی جائے اور صفحۂ قرطاس پر اس کی بھی تصویر اتار دی جائے اور جب ان تینوں قسطوں پر مشتمل کوئی کتابچہ سامنے آئے تو تصویروں کے البم میں یہ تصویر بھی نظر آ جائے۔

مدھوبنی کی تہذیبی وراثت میں مسلم رہنماؤں کا کردار

محمد وجہ القمر
صدر چراغ ویلفیئر فاؤنڈیشن
7654746192

مدھوبنی جو بھارت کی ریاست بہار کے دربھنگہ کمشنری میں واقع ایک تاریخی شہر اور ضلع ہے اپنی منفرد تہذیبی وراثت کے لیے مشہور ہے۔ اس کی ثقافتی شناخت بنیادی طور پر مدھوبنی پینٹنگ (مٹھی آرٹ) سے جڑی ہے جو عالمی سطح پر اپنی خوبصورتی اور پیچیدہ ڈیزائن کے لیے جانی جاتی ہے تاہم اس علاقے کی تہذیبی وراثت صرف فنون لطیفہ تک محدود نہیں بلکہ اس میں تاریخی، سماجی اور مذہبی عناصر بھی شامل ہیں جن میں مسلم رہنماؤں کا کردار اہم رہا ہے۔ مدھوبنی کے علاقے میں مسلم اثر ورسوخ کی ابتدا برصغیر میں مسلم فتوحات کے دور سے ملتی ہے خاص طور پر تیرہویں صدی سے جب دہلی سلطنت کے زیر اثر شمالی ہندوستان میں مسلم حکمرانی کا آغاز ہوا۔ اگرچہ مدھوبنی براہ راست کسی بڑی مسلم سلطنت کا مرکز نہیں رہا لیکن اس کی قربت دربھنگہ اور دیگر مسلم زیر اثر علاقوں سے تہذیبی تبادلے کا باعث بنی۔ مسلم رہنماؤں بشمول مقامی نوابوں، زمینداروں اور علماء نے اس خطے کی سماجی وثقافتی زندگی میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔

مسلم رہنماؤں کا کردار:

تعلیمی ودینی ترقی: مسلم رہنماؤں نے مدھوبنی اور اس کے اطراف میں دینی مدارس اور تعلیمی اداروں کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان اداروں نے نہ صرف اسلامی تعلیمات کو فروغ دیا بلکہ مقامی آبادی کے درمیان خواندگی اور شعور کو بڑھانے میں بھی مدد کی۔ مثال کے طور پر دربھنگہ کے قریب مسلم زمینداروں اور علماء نے فارسی اور عربی زبانوں کے ذریعے علمی روایت کو تقویت دی جو اس وقت انتظامی اور ثقافتی زبانوں کے طور پر اہم تھیں۔

سماجی ہم آہنگی:

مدھوبنی کی تہذیبی وراثت میں مسلم رہنماؤں کا ایک اہم کردار ہندو۔مسلم ہم آہنگی کو فروغ دینا رہا ہے۔ یہ علاقہ تاریخی طور پر کثیر المذاہب رہا ہے اور مسلم رہنماؤں نے مقامی روایات کے ساتھ مل کر مشترکہ ثقافتی تقریبات اور میل جول کو بڑھاوا دیا۔ عید، محرم اور دیگر اسلامی تہواروں کے موقع پر ہندو برادری کی شرکت اس ہم آہنگی کی مثال ہے۔

فنون وثقافت پر اثر:

اگرچہ مدھوبنی پینٹنگ بنیادی طور پر ہندو دیومالائی موضوعات سے متاثر ہے لیکن مسلم رہنماؤں اور ان کے زیر سایہ فنکاروں

نے اس فن میں اسلامی فن تعمیر اور خطاطی کے عناصر کو شامل کرنے کی کوشش کی۔ مقامی سطح پر زمینداروں اور نوابوں کی سرپرستی نے فنون لطیفہ کو فروغ دیا جس سے ثقافتی تنوع میں اضافہ ہوا۔

معاشی وانتظامی شراکت:

مسلم رہنماؤں خاص طور پر مغل دور اور اس کے بعد کے نوابوں نے مدھوبنی کے معاشی ڈھانچے کو مضبوط کیا۔ زراعت اور تجارت کے شعبوں میں ان کی سرپرستی نے مقامی ثقافت کو استحکام بخشا۔ مغل دور میں فارسی زبان کے استعمال نے انتظامی ڈھانچے کو منظم کیا جو بعد میں برطانوی دور تک اثر انداز رہا۔

تاریخی تناظر:

مدھوبنی کے قریب دربھنگہ کے راج خاندان جو ہندو مہاراجاؤں پر مشتمل تھا اس کے باوجود مسلم رہنماؤں نے ثانوی لیکن اہم کردار ادا کیا۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد بھی بہار کے کچھ علاقوں میں مسلم زمینداروں نے اپنا اثر برقرار رکھا اور مقامی ثقافت کو متاثر کیا۔ مثال کے طور پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں بہار کے مسلم زمینداروں نے فنون شاعری اور موسیقی کی سرپرستی کی جو مدھوبنی کی تہذیبی وراثت کا حصہ بنی۔

سیاسی کردار:

مدھوبنی کے مسلم رہنماؤں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا اور مقامی سطح پر عوام کو منظم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ ان کے نام قومی سطح پر زیادہ نمایاں نہیں ہوئے لیکن مقامی طور پر انہوں نے مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے پلیٹ فارمز سے کام کیا۔ مسلم رہنما اکثر سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیتے ہوئے ہندو-مسلم اتحاد کے لیے کوششیں کرتے رہے جو مدھوبنی کی مخلوط ثقافت کا حصہ تھی۔

آزادی کے بعد مدھوبنی میں مسلم رہنماؤں نے مقامی سیاست میں اپنا مقام بنایا۔ بہار کی سیاست میں مسلم رہنماؤں کی موجودگی جیسے کے کانگریس، سماج وادی پارٹیوں اور بعد میں دیگر علاقائی جماعتوں میں رہ کر انھوں نے مدھوبنی کے سیاسی منظرنامے کو متاثر کیا؛ مثلاً محمد طاہر حسین سہرولوی جو دو مرتبہ ایم ایل اے رہے اسی طرح ڈاکٹر شکیل احمد صاحب، ان کے والد شکور احمد اور ان کے دادا کے علاوہ کئی نام چین مسلم سیاسی رہنماؤں نے اس خطے کو سیاسی طور پر مضبوط کیا ساتھ ہی انہوں نے زرعی اصلاحات، تعلیم اور دیہی ترقی جیسے مسائل پر توجہ دی جو اس علاقے کی معاشی اور سماجی ساخت سے جڑے تھے۔

نتیجتاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ مدھوبنی کی تہذیبی وراثت میں مسلم رہنماؤں کا کردار براہ راست حکمرانی سے زیادہ ثقافتی، تعلیمی اور سماجی شراکت کے طور پر نمایاں ہے۔ انہوں نے اس خطے کی کثیر الثقافتی شناخت کو تقویت دی اور مقامی روایات کے ساتھ مل کر ایک ایسی وراثت چھوڑی جو آج بھی زندہ ہے۔ اگرچہ ان کے اثرات کو مدھوبنی پینٹنگ کی عالمگیر شہرت کے مقابلے میں کم نمایاں سمجھا جاتا ہے لیکن ان کی شراکت نے اس علاقے کی تہذیبی رنگارنگی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

برادران وطن اور اردو

محمد محسن ندوی سیتامڑھی
معاون اردو مترجم، بسفی بلاک
ضلع مدھوبنی

اردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی خوبصورت مثال ہے، یہ زبان نہ صرف مسلمانوں کی ثقافتی وتہذیبی وراثت کی امین ہے بلکہ اس نے ہندو، سکھ، عیسائی اور دیگر اقوام کی تہذیبی روایت کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے؛ اس نے فارسی، ترکی، عربی، سنسکرت، ہندی اور دیگر زبانوں سے الفاظ و اظہار کی خوبصورتی حاصل کی؛ میر، غالب، اقبال، نظیر اکبر آبادی، سرسید احمد خاں اور دیگر نامور شخصیات نے اردو کے دامن کو علم، فلسفہ، تہذیب، اخلاقیات اور ادب سے مالا مال کیا؛ ان کے مخاطب صرف مسلمان نہ تھے بلکہ پورا ہندوستان یا یوں کہہ لیجئے کہ پورا برصغیر تھا۔

دوسری جانب کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے غیر مسلم شعراء وادباء نے اس کی آبیاری میں اپنا بھر پور کردار ادا کیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو زبان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسے ہندی صرف ہندو کی زبان نہیں ہے ویسے ہی اردو بھی صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے؛ جو لوگ کہتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے وہ ہندوستانی زبانوں کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں، اگر اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہوتی تو کیا راجندر سنگھ بیدی، فراق گورکھپوری، پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت برج نرائن چکبست، منشی پریم چند جگن ناتھ آزاد اور جوگندر پال جیسے شعراء وادباء اس زبان میں لکھتے؟ ہرگز نہیں! اس سے یہ ثابت ہوا کہ اردو ادب، تہذیب اور جذبات کی زبان ہے جو ہر اس فرد کی زبان ہے جو اس سے محبت کرے، اسے سمجھے اور اسے اپنائے۔ ع

•••

کیوں مجھ کو بناتے ہو تعصب کا نشانہ
میں نے تو کبھی خود کو مسلماں نہیں جانا

•••

ابھی ماضی قریب میں حکومت بہار کی جانب سے بحال کردہ معاون اردو مترجمین میں بھی ہمارے برادران وطن نے کامیابی حاصل کرکے یہ ثابت کردیا کہ جس طرح دیگر قومیں اردو سے محبت کرتی ہے اسی طرح روی پرکاش اور اس جیسے ہزاروں برادران وطن

بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ایسے ہی اردو ڈائریکٹوریٹ پٹنہ کے حکم کے مطابق مدھوبنی ضلع اردو زبان سیل کے زیراہتمام منعقدہ اردو تقریری مسابقتی پروگرام منعقدہ بتاریخ ۳۱/ ۰۵/ ۲۰۲۵ء میں سمرن کماری اوراسنیہا کماری نے اردو زبان میں تقریر کر کے سب کو یہ باور کرادیا کہ اردو ذات، مذہب یا خاص قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں بسنے والے ہر ہندوستانی کی زبان ہے، بقول منصور عثمانی۔ع

•••

جہاں جہاں کوئی اردو زبان بولتا ہے
وہیں وہیں مرا ہندوستان بولتا ہے

•••

خلاصہ یہ کہ برادران وطن کا اردو زبان کی طرف رجحان نہ صرف خوش آئند ہے بلکہ اردو کی ہمہ گیر اور مشترکہ تہذیب کا زندہ ثبوت بھی ہے، یہ رجحان اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اردو کسی ایک قوم کی جاگیر نہیں بلکہ ایک ایسی زبان ہے جو سب کو اپناتی اور اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے۔ہمیں چاہئے کہ اس کی حوصلہ افزائی کریں اور اردو کو ایک محدود دائرے سے نکال کر ایک ہمہ گیر زبان کے طور پر فروغ دیں تاکہ آنے والی نسلیں بھی اس تہذیبی خزانے سے فیضیاب ہوسکیں۔

اردو ترجمہ نگاری اور ہماری ذمہ داری

محمد اشرف رضا
معلم سینئیر سیکنڈری اسکول ملنگیا رہیکا
مدھوبنی بہار 9097751211

اظہار خیال اور مافی الضمیر کی ادائیگی کے لیے زبان سب سے موثر ذریعہ ہے، دنیا میں نہ جانے کتنی زبانیں بولی جاتی ہیں ہر ملک میں ایک سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہمارا ملک ہندوستان زبان کے تعلق سے اپنے آپ میں دنیا کا ایک انوکھا ملک ہے کیونکہ اکیلے ہندوستان میں ہی سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں اس لیے ہندوستان کو زبانوں کا "عجائب گھر" کہا جاتا ہے اور ہندوستان کے لیے ہی کہا جاتا ہے "کوس کوس پر بدلے پانی اور چار کوس پر وانی"۔ ان میں علاقے کے اعتبار سے کچھ مادری زبانیں ہیں جنہیں ماں کی گود، اہل خانہ اور قرب وجوار سے سیکھی جاتی ہیں۔ ان کی حصولیابی کا مرحلہ آسان ترین ہے کیونکہ یہ زبانیں قدرتی طریقے سے رفتہ رفتہ انسان کے اندر حلول کر جاتی ہیں جیسے جیسے زندگی کے لمحات گزرتے چلے جاتے ہیں اس زبان پر قدرت تامہ بذات خود ہوتی جاتی ہے۔ کچھ ایسی زبانیں ہیں جنہیں محنت، مشقت اور ریاضت سے حاصل کی جاتی ہیں۔ عموماً ایسی زبانیں قواعد اور قوانین وضوابط کے ذریعہ استعمال میں لائی جاتی ہیں، انکی تحصیل میں جہد مسلسل کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایک مادری زبان کے علاوہ باقی سبھی زبانیں کم وبیش کسبی ہوتی ہیں۔ اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کتنی زبانوں کو سیکھے جس سے دنیا بھر کی بیشتر زبانوں میں موجود اہم جانکاریوں اور قیمتی معلومات پر قدرت ومہارت حاصل کر سکے؟ یہ امر محال ہے کہ ایک انسان ہر زبان کو سیکھے یا اس کا کسب کرے کیونکہ یہ ایک نہایت ہی مشکل ترین عمل ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے ایک ایسی تدبیر وضع کی جاتی ہے جس سے دنیا بھر کی دوسری زبانوں میں پڑی معلومات ومفہومات کو اپنی زبان میں بھی حاصل کرنے کی سہولیات میسر ہو سکے۔ اس کے لیے اصطلاح میں ایک لفظ استعمال ہوتا ہے "ترجمہ"۔ ترجمہ کے ذریعے کسی بھی زبان وادب کے فہم و ادراک اور شعور وفکر کو ہم اپنی مادری زبان میں حاصل کرتے ہیں۔ اس مضمون کا مقصد اردو ترجمہ نگاری کے ذریعہ جدید وعصری علوم و فنون کی دستیابی ہے۔ تو آیئے پہلے ترجمہ کے معنی ومفہوم کو سمجھتے ہیں پھر اس کے جملہ پہلوؤں پر گفتگو ہوگی۔

ترجمہ کا معنی ومفہوم:

لغت کے اعتبار سے کسی معنی، مفہوم یا مطلب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنا ترجمہ کہلاتا ہے (النقل عن لغۃ الی اخری)۔ اس کے لیے انگریزی میں Translation لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ عرب تہذیب کے اعتبار سے اگر ہم نے کسی شخص کے سوانح کو بیان کیا تو گویا اس کا ترجمہ کر دیا۔ ترجمہ کا کام ہے "لامعلوم کو معلوم کر دینا"۔ اسی لئے کسی کی سوانح حیات یا حالات بیان کرنے کو عربی میں ترجمہ کہتے ہیں، یہ معنی اردو میں بھی ہیں لیکن بہت معروف نہیں ہے۔ ترجمہ کی یہ بہت ہی نایاب خدمت ہے کہ اس سے زبانیں زیادہ ترقی یافتہ ہو جاتی ہیں۔ ترجمہ کے ذریعے نئی ترتیب، نئے خیالات اور نئے اظہارات زبانوں میں داخل ہوتے ہیں اور انہیں ثروت مند بناتے ہیں۔ ترجمہ ایک مشکل ترین مسئلہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ مشغلہ بھی ہے کیونکہ اس عمل میں کم از کم دو زبانوں پر مہارت لازم ہے: ایک وہ زبان جس سے ترجمہ کیا جائے اسے سورس زبان (Source Language) کہتے ہیں اور دوسری وہ زبان جس میں ترجمہ کیا جائے اسے ٹارگیٹ زبان (Target Language) کہتے ہیں۔

تاریخ وروایت:

اردو ترجمہ کی روایت بہت قدیم ہے، شروع میں عربی اور فارسی کی حکایتوں کے اردو میں ترجمے کیے گئے۔ بعدہ سنسکرت، ترکی اور انگریزی زبانوں کے ترجمے بھی عام ہوتے چلے گئے۔ اردو کی اولین اور سب سے قدیم مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" (مصنفہ فخر دین نظامی) میں عربی اور فارسی کے اکثر محاورے، تشبیہات واستعارات، تلمیحات اور ضرب الامثال کے ترجمے موجود ہیں۔ وقت کی رفتار کے ساتھ مختلف اداروں اور تنظیموں نے اردو ترجمے کی روایت کو مزید مستحکم کیا؛ ان میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دارالترجمہ شمس الامراء حیدرآباد، ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی دہلی، سائنٹیفک سوسائٹی (پہلے غازی پور بعد میں علی گڑھ)، مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دارالترجمہ جموں کشمیر (1850ء)، دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو (دہلی) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس دوران دل میں خلجان پیدا ہوتا ہے کہ اردو میں پہلا ترجمہ کون سا ہے؟ اس تعلق سے جواباً یہ عرض ہے کہ "تمہیدات ہمدانی" کا ترجمہ عربی سے اردو میں کیا گیا۔ اس کتاب کے عربی زبان کے مصنف ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی ہیں۔ اس کتاب کو اردو کے پیکر میں شاہ میراں جی شمس العشاق نے ڈھالا۔ اس طرح "تمہیدات ہمدانی" کو عربی سے اردو کا پہلا ترجمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ شاہ محمد رفیع نے 1776 میں اور بعد میں شاہ عبدالقادر نے 1795 میں اردو ترجمہ پیش کیا۔ فارسی ادب سے اردو ادب میں ترجمے کا ابتدائی نمونہ ابوالفتاحی نیشاپوری کی تصنیف "دستور عشاق" (فارسی) کا اردو ترجمہ "سب رس" کے نام سے ملا وجہی نے کیا تھا جسے اردو کا پہلا نثری نمونہ کہا جاتا ہے۔ فارسی سے اردو میں ترجمہ کی کچھ اہم مثالیں حسب ذیل ہیں۔: شیخ محمود کی فارسی تصنیف "معرفت السلوک" کا اردو ترجمہ شاہ ولی اللہ قادری نے، "طوطی نامہ" کا اردو ترجمہ سید محمد قادری نے، ملا واعظ حسین کاشفی کی فارسی تصنیف "سید الشہداء" کا اردو ترجمہ "کربل کتھا" کے نام سے ملا فضل علی فضلی نے کیا تھا جبکہ مغربی ادب سے اولین ترجمہ کے نمونے کی بات کی جائے تو اس تعلق سے مرزا حامد بیگ صاحب کا کہنا ہے "راسلس" (از ڈاکٹر سیموئل بس حبان) کا اردو ترجمہ سید محمد میر لکھنوی نے "تواریخ راسلس" شہزادہ حبش کی (مطبوعہ آگرہ طبع اول 1839ء) کے نام سے کیا۔

اس کی اہمیت اس وجہ سے اہم ہے کہ بلا کسی شک وشبہ کے مغرب کی کسی بھی زبان سے اردو میں ہونے والا کتابی صورت میں یہ پہلا ادبی ترجمہ ہے۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ اس سے قبل ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے "ہندوستانی زبان کے قواعد" (مطبوعہ کلکتہ طبع اول 1796ء) میں ولیم شیکسپیئر کے دوڈرامے "ہیملیٹ" اور "ہنری ہشتم" کے دو چیدہ اقتباسات کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ اسی طرح سنسکرت زبان سے اردو ترجمے کے کئی نمونے دستیاب ہیں۔ جیسے رگ وید سنہتا حصہ اول کے نام سے ماسٹر لکشمن داس نے 1873ء میں اردو ترجمہ کیا، "رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا" کا رام جگن ناتھ رائے نے 1898ء میں اردو ترجمہ کیا، رگ وید کا مولوی ولایت علی نے اردو ترجمہ کیا اور "تحقیق پھر" کے نام سے اثر لکھنوی نے اردو ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

اہمیت وافادیت:

ترجمہ نگاری ایک طرف دوسری زبان میں موجود معلومات ومفہومات اور فکروفن کو اپنی زبان میں بآسانی پڑھنے، سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے تو دوسری طرف اس کے تعلق سے، بہت سے منفی تاثرات بھی پیش کئے گئے ہیں؛ جیسا کہ پروفیسر محمد حسن کچھ یوں رقم طراز ہیں: ضرورت اکثر برائیوں کو اچھائیوں میں بدل دیتی ہے، ایسی ہی ایک برائی ترجمہ بھی ہے، مترجم کو غدار اور گندم نما جوفروش کہا گیا ہے۔ ترجمہ اگر اصل کا کام دینے لگے تو ترجمہ کیوں کہلائے لازمی طور پر اصل سے کم ہوگا اور جو کم تر ہو وہ برائیوں میں کیوں نہ گنا جائے مگر ضرورت کہتی ہے کہ عالمگیر آگہی کا نور اور سرور ایک زبان کے دامن میں تو سمٹنے سے رہا جب تک زبان کے بولنے والے دوسری زبانوں کے علم وآگہی، جذبے اور شعور، فکر واحساس، تکنیک اور سائنس تک پہنچنا چاہیں گے ترجمے کا سہارا لیں گے۔ خواہ یہ سہارا کیسا ہی ناقص اور ناتمام کیوں نہ ہو۔ بینادی طور پر ترجمہ لسانی اور تہذیبی مفاہمہ ہے جو نہ اصل کی لذت کو پوری طرح پاسکتا ہے نہ اس سے مکمل طور پر محرومی کو قبول کرتا ہے۔ اردو زبان وادب کی وسعت اور تکنیکی سطحوں پر گہرائی اور گیرائی میں ترجمہ اور اخذ کا خاصا اہم کردار رہا ہے۔ تراجم نے نئے اسالیب کو جنم دیا، نئے طرز احساس کو ابھارا، پیرایہ بیان میں صلابت، متانت اور استدلال کو بڑھاوا دیا اور پیرایۂ اظہار کے نئے نئے سانچے فراہم کئے۔

وقت کا تقاضا:

موجودہ سائنس، ٹیکنالوجی اور ترقی کے زمانہ میں ہر چیز اپنے عروج کی طرف گامزن ہے؛ بلندی کی غایت تک پہنچنے کی سعی کرنا ہر کسی نے پیشہ بنالیا ہے۔ جہاں تک زبان وادب کی بات ہے تو مجموعی طور پر ماہرین اور محبان لسانیات اپنی اپنی زبانوں کو بام عروج تک پہنچانے کی مسلسل جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اردو ادباء، شعراء، دانشوران اور جملہ اردو عملہ ومحبین کو بھی ادب کی بقاء اور تسلسل کو یقینی بنانے کے لئے نیز اردو کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بشانہ چلنے کے اہل بنانے کے لئے کچھ حکمت عملیوں کو بروئے کار لانے کی اشد ضرورت ہے اس کے لئے دو اہم اقدامات کو عملی جامہ پہنا کر اس کے وجود وسالمیت کو حیات جاودانی بخشی جاسکتی ہے۔

ان میں سے اول تخلیق وتصنیف، اس کے تحت ماہرین علوم وفنون اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے سائنس ریاضی، فلکیات، حیاتیات، کیمیاء، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات وغیرہ کے مواد سے اردو کے دامن کو وسیع بنا سکتے ہیں۔ دوم ترجمہ نگاری کے ذریعہ اردو زبان میں علمی

سرمایہ کا اضافہ کرنا۔عموماً اردو ادب کو شعروشاعری، غزل سرائی اور مشاعرہ کی زینت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو کو خفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ یہ زبان بھی دیگر زبانوں کی طرح اعلیٰ معیار کی تعلیم وتربیت فراہم کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔

اس کے علاوہ اردو زبان میں عصری تعلیم کے موضوعات کی قلت کے سبب خالص اردو سے منسلک بے شمار اشخاص سائنس و ٹیکنالوجی کی معلومات اور عصری تعلیم سے ناآشنا ہیں۔انہیں ان موضوعات کے صحیح علم کی ناواقفیت کی بنیاد پر ہلکا گردانا جاتا ہے۔ ہمارے بہت سے طلباء ریاضی، سائنس اور دوسری عام جانکاریاں، دوسری زبان میں سیکھتے ہیں تبھی انہیں ان موضوعات پر گرفت ہو پاتی ہے ورنہ اردو کے بھروسے رکنا ہنوز دلی دوراست والی بات ہوجاتی ہے۔حالانکہ اردو میں اظہار خیالات کی تمام تر قابلیت و صلاحیت موجود ہے تو پھر اس زبان میں عام معلومات کی تصنیفات یا دوسری زبانوں کے علمی مواد کو تراجم کے ذریعے اردو میں منتقل کر شائع کیا جائے تو بلاشبہ اس کی افادیت میں اضافہ ہوگا؛ اردو سے منسلک افرا، دطلبہ وطالبات بھی جدید اور عصری تعلیم کو سہل طریقے سے حاصل کریں گے۔مذکورہ گفتگو سے ایسا تصور نہ کیا جائے کہ ماضی میں اردو ترجمہ نگاری کے جوہر زمانہ نے نہیں دیکھا ہے بلکہ ایک سے ایک مایہ ناز تراجم موجود ہیں مگر عوامی سطح پر اس کی پہنچ نہیں ہوسکی ہے۔یہ بھی امر مسلم ہے کہ اردو وہ گلدستہ ہے جس میں ہندی ،فارسی عربی، ترکی، سنسکرت اور دیگر مقامی کلیوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔یہ صرف شاعری کی زبان نہیں بلکہ انسانیت کے عالمی خواب کی تعبیر بھی ہے۔لہذا اردو کو اظہار رائے کا ذریعہ بناتے ہوئے اردو ترجمہ نگاری کو فروغ دیا جانا اس کے مستقبل کی تابناکی کا ضامن ہوگا۔

لائحہ عمل:

اردو زبان کے تحفظ کے لیے ٹھوس اور دوررس نتائج پر مبنی حکمت عملی مرتب کرنا ہوگا۔اس کی حفاظت صرف رسمی نہیں بلکہ قومی ولسانی فریضہ سمجھتے ہوئے کرنا ہوگا۔اسے فروغ دینے کے لیے تعلیمی اداروں، سوشل پلیٹ فارمز اور میڈیا پر سنجیدہ اور حکمت عملی کی کوشش جاری رکھنی ہوگی کیونکہ زبان صرف رابطے کا وسیلہ نہیں بلکہ تہذیبی ورثے کی امین بھی ہوتی ہے۔اگر زبان مرجاتی ہے تو تہذیب بھی اس کے ساتھ دم توڑ دیتی ہے۔زبان انسانی شعور اور تمدنی ارتقاء کا خمیر ہوتی ہے۔اردو کی حیات و بقاء اور اس وراثت کو آنے والی نسل تک پہنچانے کے لئے ترجمہ نگاری کو فروغ دینا ہوگا۔اردو ترجمہ نگاری کو فروغ دینے کے لئے چند اہم گزارشات پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔جیسے:

سرکاری اردو افسران، ملازمین، مدرسین ومعانین سبھی اپنی ملازمت کی خاص ذمہ داریوں کے علاوہ قومی اور لسانی فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنی جانب سے کچھ لوگوں کی ٹیم بنا کر اردو ترجمہ نگاری کی روایت کو آگے لے جاسکتے ہیں۔

جملہ اردو عملہ اپنے شعبوں سے باہر کے ایسے افراد کی مدد سے اس نیک کام کو انجام دے سکتے ہیں جو اردو اور دیگر زبانوں کے ماہرین ہیں۔

حالیہ چند سالوں میں سرکار کی طرف سے خصوصاً بہار میں کافی تعداد میں اردو مترجمین اور اردو اساتذہ کی تقرری کی گئی ہے۔

ان دونوں گروپ کے تمام سرگرم افراد کی خدمت شامل ہو جائے تو اردو اور اس کے نونہالوں کے لئے منزل تک رسائی آسانی سے ہو جائے گی۔

ضلع، سب ڈویژن اور بلاک سطح پر کچھ لوگوں کی جماعت بنائی جائے جو ملازمت میں نہ رہتے ہوئے بھی اردو کی بے لوث مدد کرنا چاہتے ہیں۔

مکاتب اور مدارس کے نصاب میں سائنس، ریاضی، سماجیات اور عام معلومات کی کتابوں کی شمولیت ہو۔

نصابی کتابوں کے علاوہ رسالے اور اخبارات میں سائنسی پہلوؤں پر منحصر مختصر واقعات، فقرے، لطائف اور مذاکرات مذکور ہوں۔

مختلف مواقع پر سائنسی موضوعات پر اردو زبان میں تقریری و تحریری مسابقوں کا انعقاد ہو۔

قومی اور ریاستی سطح پر موجود اردو ادارے اور اکیڈمیاں بھی اس جانب اپنی خاص توجہ مبذول کریں۔

ہم لوگ اپنی تمام علمی، فکری اور عملی توانائیاں اردو کے لیے وقف کر دیں۔

ہمیں بغیر تعصب کے لسانی حمیت کا خیال رکھتے ہوئے اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے عملی اقدام اٹھانے ہونگے۔

آخر میں اردو کے لئے چند دعائیہ کلمات بشکل اشعار پیش خدمت ہے۔۔۔ع

خدا تجھے عروج ایسا عطا کرے
کہ رشک تیرے نصیب پہ فلک کرے
ہر موڑ پر فرشتے ہوں ساتھ تیرے
ہر موڑ پہ تیری حفاظت خدا کرے

کتابیات:

(1) سنسکرت ادب کے اردو تراجم از شیخ عبدالغنی (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی اشاعت 2015)

(2) اردو ترجمہ کی روایت از سید حامد بیگ (دوست پبلشنگ اسلام آباد اشاعت 2016)

(3) اردو میں ترجمہ کی روایت از IGNOU

عصر حاضر کی صحافت میں اخلاقیات کا فقدان

محمد انصار چندرسین پور
معلم پلس ٹو ہائی اسکول
مدھے پور پوربی مدھوبنی

صحافت عربی زبان کا لفظ ہے جو صحت سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی کتاب یا رسالہ کے ہیں یعنی ایسا مطبوعہ مواد جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع ہوتا ہے صحافت کہلاتا ہے، اردو اور فارسی میں یہی اصطلاح رائج ہے؛ سب سے پہلے ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ صحافت ایک ایسا فن ہے جس کے لئے مسلسل محنت کی ضرورت ہے، اس بات کو بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ صحافت صرف ایک پیشہ ہی نہیں بلکہ جمہوریت کا ایک اہم ستون بھی ہے بلکہ اکثر لوگ اس کو ریاست کا سب سے زیادہ طاقتور ستون قرار دیتے ہیں۔

صحافت (Journalism) کسی بھی معاملہ کے بارے میں تحقیق اور پھر اسے صوتی، بصری یا تحریری شکل میں بڑے پیمانے پر قارئین، ناظرین یا سامعین تک پہونچانے کے عمل کا نام ہے؛ تکنیکی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو شعبہ صحافت کے کئی معنی اور اجزاء ہیں لیکن سب سے اہم نکتہ جو صحافت سے منسلک ہے وہ عوام کو باخبر رکھنے کا ہے؛ مختلف شعبہائے زندگی میں کچھ اخلاقی قدروں کو تسلیم کرنے اور ان پر عمل کئے جانے پر ہمیشہ سے انسانی سماج میں زور دیا جاتا رہا ہے؛ صحافت بھی ایک ایسا میدان ہے جس کی اخلاقیات طے کی گئی ہیں مگر افسوس کہ موجودہ دور میں صحافت میں اخلاقیات مضمحل ہوتا نظر آرہا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب صحافت کو مشن سمجھا جاتا تھا لیکن افسوس کہ اب صحافت محض ایک پیشہ ہے؛ واقعہ یہ ہے کہ سماج کی بدلتی ہوئی قدریں صحافتی اخلاقیات پر اثرانداز ہوئی ہیں؛ "خبر کیا ہے؟" اور "خبر کیا نہیں ہے" میں امتیاز نہ برتنے کی غلط روش نے صحیح اور غلط کے مابین فرق کو ہی مٹا دیا ہے، کاش صحافت سے وابستہ حلقہ پروفیشنل اتھکس (Professional Ethics) کو ملحوظ خاطر رکھے اور ہمہ وقت اس کا استحضار کرتا رہے تو صحافت کو صحیح، مثبت اور تعمیری رخ دینے کا کام بآسانی انجام پاسکے۔

ہندوستان اور بین الاقوامی میڈیا کے سرکردہ اداروں نے اس کے لئے کچھ بنیادی اصول وضع کئے ہیں انہیں کو پروفیشنل اتھکس کہا جاتا ہے؛ ذرائع ابلاغ چاہے وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں بڑی سماجی ذمہ داری ادا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ صحافت کو جمہوریت کا ایک اہم ستون قرار دیا گیا ہے۔ بدگمانی، بھکمری، غربت، عدل وانصاف، ناخواندگی، ظلم وزیادتی سے جڑے ہوئے موضوعات سے متعلق واقعات کی ریڈنگ کرنا یقیناً ایک صحافی کا اپنا سماجی فرض نبھانا ہے، ایسے تمام واقعات کی رپورٹنگ اور ان کو پیش کرنے میں بنیادی عنصر معروضیت کا ہے۔

میڈیا واچ ڈاک، انڈیا براڈ کاسٹنگ فاؤنڈیشن، ایڈٹرس گلڈ، پریس کونسل آف انڈیا وغیرہ نے معروضیت کو خبر یا رپورٹ کی بنیاد قرار دیا ہے جس کے تحت ذاتی رائے کو شامل کئے بغیر مسئلے سے تعلق رکھنے والی اصل اور مکمل صورت حال کو پیش کرنا ضروری ہے؛ اس کا دوسرا عنصر ایمانداری ہے چنانچہ خبر رسانی میں واقعات کو چھپانے یا توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہوسکتی اور واقعہ ہے کہ اگر ایمانداری نہ ہوگی تو صورت حال کی سچی رپورٹنگ نہ ہوسکے گی اور صحیح غلط کے مابین امتیاز قائم کرنا دشوار ہوجائے گا۔

اس دور کا سب سے بڑا چیلنج میڈیا ہے اور انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ میڈیا کا موثر ترین اور طاقتور ہتھیار ان لوگوں کے پاس ہے جن کے پاس نہ ہی انسانیت کے غم میں تڑپنے والا دل ہے اور نہ ہی ان کی بدنصیبی پر آنسو بہانے والی آنکھ اور نہ انسانیت کی فلاح و بہبود اور تعمیر وترقی کا کوئی منصوبہ ہے؛ میڈیا کی یہ طاقت تعمیر کے بجائے تخریب، کردار و اخلاق سنوارنے کے بجائے بے حیائی و بد اخلاقی اور انسانوں کی رہنمائی کے بجائے انہیں حق سے بھٹکانے کے لئے استعمال ہورہی ہے؛ انہیں حقیقتوں کی جانب توجہ دلاتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی صحافیوں سے اکثر یہ فرمایا کرتے تھے: "زیر قدمت ہزار جان است"۔

حاصل یہ کہ سماج کے بناؤ بگاڑ میں صحافت کا کردار بڑا اہم اور موثر ہے، اگر اخلاقیات پیش نظر رہیں تو وہ صحافت مثبت صحافت کہلائے گی اور تعمیری رول ادا کرے گی ورنہ وہ منفی صحافت یا زرد صحافت یا جذباتی وجانبدارانہ صحافت سے تعبیر کی جائے گی جو ظاہر ہے سماج میں انتشار اور بے راہ روی کا باعث بنے گی؛ اس لئے ضروری ہے کہ صحافت کی صحت مندانہ روایات پر گرفت مضبوط کی جائے اور یہ کام صحافیوں کے مزاج وذوق پر مبنی ہے؛ "فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے" کہ وہ ظالم کی مدد کرنا پسند کرتے ہیں یا مظلوم کی؛ صحافی مفادات سے بلند ہوتا ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک صحافی کو حق کا طرفدار ہونا چاہئے، سچائی کا دامن اس وقت اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا جب وہ مفادات کے تابع ہوجائے گا، چاہے وہ مفادات نجی وگروہی نوعیت کے ہوں یا فرقہ وارانہ نوعیت کے؛ اگر ایک صحافی کو مفادات عزیز ہوگئے تو وہ صحافی کہلانے کے بجائے پروپیگنڈسٹ کہلائے گا اور حقائق سے اسے کوئی سروکار نہ ہوگا بلکہ حقائق کو نظرانداز کرنے اور بعض دفعہ مسخ کرنے کا وہ مجرم ہوگا۔

ذرائع تو بذات خود معصوم ہوتے ہیں البتہ صحافت کی دودھاری تلوار کا استعمال صحافی کے فیصلہ پر ہے چاہے تو وہ ظلم وبدعنوانی کے خلاف شمشیر برہنہ بن جائے یا ظلم کی حمایت میں اپنی توانائیاں صرف کردے، حق کو ناحق قرار دے اور بگاڑ کو سدھار کا نام دے دے، چاہے تو فحش ومنکرات کو فروغ دے یا ان پر روک لگائے۔ ع

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

بات صحافت کے اخلاقیات کی چل رہی ہے لیکن صورت حال یہ ہے کہ موجودہ معاشرہ کے اخلاقی زوال میں میڈیا بڑا منفی اور تخریبی کردار ادا کررہا ہے۔ فحش تصویریں اور عشقیہ مکالموں کی اشاعت نے نئی نسل کے اخلاق وکردار کو جس مرحلہ اور موڑ پر پہونچا دیا ہے اس کے تصور سے ہی روح کانپ جاتی ہے۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں   محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

صحافت کا کام قبلہ نمائی اور رہنمائی کا ہے اور صحافت سے وابستہ افراد کے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ وہ ادھر ادھر کی بات نہ کریں بلکہ یہ بتائیں کہ قافلہ کیوں لٹا؟

کلیم عاجز بطور غزل گو شاعر

راہی قاسمی
معاون اردو مترجم، جے نگر مدھوبنی

اردو شاعری کی فضا میں جب روایتی غزل اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے جدید حسیت سے ہم کنار ہو رہی تھی تب کلیم عاجز ایک شاعر کے طور پر ابھرے جنہوں نے کلاسیکی روایت کو ترک کیے بغیر غزل کو نئی زندگی عطا کی؛ وہ نہ صرف ایک خوش نوا شاعر تھے بلکہ اردو زبان کی تہذیبی و فکری وراثت کے امین بھی تھے؛ ان کی غزلیں محض اشعار کا سلسلہ نہیں بلکہ جذبات، تجربات، مشاہدات اور تہذیب کا فطری اظہار ہیں۔

کلیم عاجز کی شاعری میں غالب، میر اور فراق کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور ساتھ ہی ان کی اپنی انفرادیت بھی قائم ہے؛ وہ روایت سے وابستہ رہے مگر زمانے کی دھڑکن کو بھی محسوس کرتے رہے؛ ان کی غزلوں میں محبت، جدائی، وفا، بے وفائی جیسے روایتی موضوعات اپنی پوری لطافت کے ساتھ موجود ہیں مگر اسلوب میں ندرت اور لہجے میں تازگی نظر آتی ہے؛ ان کی غزلیں جذباتی، صداقت اور تہذیبی سلیقے کا بہترین امتزاج ہیں۔

کلیم عاجز کی زبان شائستہ سادہ اور محاورتی ہے وہ بات کو پیچیدہ بنانے کے قائل نہیں بلکہ سہل ممتنع کے حسن کے ساتھ شعر کہتے ہیں؛ ان کے یہاں الفاظ کا انتخاب نہایت نپا تلا اور سلیقے سے ہوتا ہے؛ روزمرہ کی زبان کو شعری زبان میں ڈھال دینا ان کا کمال ہے؛ انہوں نے کہا ہے۔ع

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

•••

ان کے اشعار زندگی کے سادہ تجربات کو انتہائی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں، اکثر ان کی شاعری میں زندگی کے نشیب و فراز، تعلقات کی نرمی و تلخی اور تہذیب کی شکست و ریخت کا عکس دکھائی دیتا ہے؛ کلیم عاجز کو مشاعرہ کا شاعر کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا؛ ان کی غزلوں میں جو ترنم، تاثیر اور جذبہ پایا جاتا ہے وہ مشاعرہ کے سامعین کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا؛ ان کا لہجہ، ادائیگی اور موضوعات ہر طرح کے سامعین کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے؛ وہ کبھی جذبات سے کھیلتے تو کبھی ہلکے طنز سے محفل کو قہقہوں سے بھر دیتے؛ ان کی

مشاعروں میں شرکت سامعین کے لئے یادگار تجربہ ہوا کرتی تھی ان کا ایک مشہور شعر ہے۔ ع

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

یہ شعر تنہائی، خود فراموشیاور وجودی الجھن کی ایسی تصویر کھینچتا ہے جو قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔

کلیم عاجز کی غزلوں میں محبت ایک گہرا اور مسلسل جزبہ ہے جو نہ صرف محبوب سے وابستہ ہے بلکہ انسانیت، زبان اور تہذیب سے بھی؛ انہوں نے جدائی اور انتظار کو ایسے انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری خود کو اس تجربے میں شریک محسوس کرتا ہے؛ ان کی شاعری میں محبوب ایک علامت ہے جو کبھی وطن ہے، کبھی زبان اور کبھی تہذیب۔ ان کی خودنوشت "جور کے تو کوہ گراں تھے، ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے" بھی ان کی شخصیت اور شعری وجدان کا ایک عکاس آئینہ ہے جس سے ہمیں ان کے فکری و تہذیبی پس منظر کا شعور ملتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کلیم عاجز اردو غزل کے ان معتبر ناموں میں سے ہیں جنہوں نے روایت کو نہ صرف سنبھالا بلکہ اسے عصری احساس کے ساتھ جوڑ کر نئی توانائی عطا کی؛ ان کی غزلیں دل کو چھو لینے والی سادہ مگر گہری اور شعری حسن سے بھر پور ہیں؛ وہ غزل کے صرف شاعر نہیں اس کے عاشق بھی تھے اور یہی محبت ان کے ہر شعر سے جھلکتی ہے؛ ان کا نام ہمیشہ ان شعراء کی فہرست میں شامل رہے گا جنہوں نے اردو شاعری کو نہ صرف جیا بلکہ اس کو جلا بھی بخشی۔

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

•••

مدھوبنی ضلع میں فروغِ اردو: اقدامات اور امکانات

ڈاکٹر محمد حسین مصباحی
معلم سینئر سیکنڈری اسکول
مشرقی سریسب پاہی، پنڈول مدھوبنی

مدھوبنی ضلع جسے متھلا کا مرکزی مقام ہونے کا امتیاز حاصل ہے، علم و دانش کی وجہ سے اس سرزمین کی شہرت ہے۔ لیکن اردو زبان وادب کے سلسلے میں تھوڑی مایوس کن فضا ہے البتہ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس مایوس کن فضا میں بھی کچھ نہ کچھ اردو کے شیدائی بلا کسی ستائش کے اپنا کام کر رہے ہیں۔ ادارہ کی سطح پر ہمارے اسکول، کالج، مدارس اور کوچنگ میں بھی اردو کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہے۔ اردو کے فروغ کے لیے کبھی کبھی تنظیمیں بھی رونما ہوتی ہیں لیکن جلد ہی روپوش بھی ہو جاتی ہیں باضابطہ ادارہ جاتی سطح پر اردو زبان سیل مدھوبنی اردو زبان کے فروغ کے لیے سرگرم دکھائی دیتا ہے۔ اس سے وابستہ عہدے داران اور مترجمین نے اپنی ذاتی دلچسپی بھی دکھائی تو قدرے ماحول سازگار رہا ہے۔

سرکاری امداد پر محکمہ کابینہ سیکریٹریٹ کے زیر اہتمام ضلع اردو زبان سیل ہر سال دو تین با مقصد اردو تقریب کا انعقاد کرتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگلے کئی برسوں تک شاید یہی ایک پلیٹ فارم رہے جہاں اردو کے فروغ کی باتیں ہوں، نت نئے عناوین پر علمی مقالات سننے کو ملیں۔ ضلع اور خطے کے نوجوان اور سینئر شعرا کو سننے کا موقع ملے۔ ضلع اردو زبان سیل کی دریافت سے ہمیں اپنے ضلع کے ادبا، اسکالر اور دانشوران سے روبرو ہونے کا موقع ملتا رہتا ہے، ہمیں اردو زبان سیل کے ذمے داران اور عہدے داران کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ وہ ہر سال کے پروگرام میں ہمیں کسی نہ کسی ایسی شخصیت سے روبرو کراتے ہیں جن سے ہم بمشکل روبرو ہو پاتے ہیں۔

اردو زبان سیل، بہار سرکار کے محکمہ کابینہ سیکریٹریٹ کے تحت کام کرتا ہے۔ جس کا دفتر ضلع کلکٹریٹ کی عمارت کے ہی ایک گوشے میں ہوتا ہے۔ اردو زبان سیل ضلع کے مختلف بلاک اور سب ڈویژن میں مامور اردو مترجمین اور نائب اردو مترجمین کے درمیان رابطہ سازی اور رہنما خطوط تیار کرتا ہے۔ اردو مترجمین اور معاون اردو مترجمین کی ماہانہ نشست بھی منعقد کرتا ہے جس میں ضلع میں مامور تمام مترجمین فرائض منصبی کے ساتھ فروغ اردو کے تئیں اپنی پیش رفت کی روداد بھی پیش کرتے ہیں۔ جب ہر مہینے اتنے ذہین اور باصلاحیت لوگوں کا ایک جگہ اجتماع ہوتا ہے تو علمی و ادبی اور لسانی مباحث بھی ہوتے ہوں گے ساتھ ہی اردو کے فروغ سے متعلق منصوبہ بندی بھی ہوتی ہوگی۔

میرے بلاک جے نگر میں مامور معاون اردو مترجم راہی قاسمی صاحب اور شہنشاہ صاحب کی کوششوں سے بلاک اور سب

ڈویژن کے دفتروں کے نیم پلیٹ بھی اردو میں دکھائی دے رہے ہیں۔ اگر چہ یہ نیم پلیٹ عارضی یعنی پیپر پرنٹ پر لگے ہیں، لیکن امید ہے کہ ان کی کوششوں سے مستقل نیم پلیٹ ضرور لگیں گے لسانی تعصب کے ماحول میں ایسی کوششیں بھی بہت دل گردے کے کام ہیں .خدا انہیں مزید حوصلہ اور توانائی عطا کرے۔

اردو زبان سیل ہر سال باضابطہ دو پروگرام منعقد کراتا ہے۔ایک فروغ اردو سیمینار، ورک شاپ اور مشاعرہ کے نام سے اور دوسرا ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ اور گریجویشن کے طلبہ وطالبات کا تقریری مسابقہ۔سیمینار، ورک شاپ اور مشاعرہ سیمینار میں اردو زبان کو درپیش مسائل پر بھی غور وخوض کیا جاتا ہے۔اور ادب وثقافت کے موضوعات پر علمی اور فکری مقالات ومضامین بھی ہمیں سننے کو ملتے ہیں۔

سیمینار کے شرکا میں نامور ادبا اور اسکالر کی شرکت:

۱۶-۲۰۱۵ سے میں اردو زبان سیل مدھوبنی کی ادبی تقریبات میں شامل ہوتا رہا ہوں پروگرام میں کبھی بحیثیت سامع کبھی بحیثیت مقالہ خواں، شامل ہوتا رہا ہوں۔اس پروگرام کی بدولت اپنے ضلع کے نامور اردو ادبا و اسکالر سے روبرو ہونے کا موقع ملتا ہے۔میتھلی اور اردو کے شاعر و ادیب صدر عالم گوہر صاحب، ایسے ہی میتھلی اور اردو کے جانے مانے ادیب، شاعر اور اسکالر ڈاکٹر منظر سلیمان بھی فروغ اردو سیمینار میں شرکت فرماتے رہے ہیں۔یہ دونوں حضرات میتھلی اور اردو کے جانے مانے اسکالر اور ادیب ہیں۔ملک کے الگ الگ خطوں کے بڑے اور اہم سیمینار میں بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہیں۔منظر سلیمان صاحب کی اہم ایک میتھلی نظم "ویشواشانت" کے عنوان سے بہار کے اسکولی نصاب کی درجہ 9 کی میتھلی کتاب میں شامل ہے۔ان کے علاوہ ڈاکٹر عمر فاروق، تذکرہ شعرائے مدھوبنی کے مصنف مولانا حسیب الرحمان شائق جے این یو کے سینیئر ساتھی ڈاکٹر ابرار اجراوی، مولانا عارف اقبال مصباحی، ارشاد برکاتی وغیرہ جیسے اہل علم ودانش کے مضامین ومقالات بھی سننے کو ملتے رہے ہیں۔خوشی کی بات یہ ہے کہ ہر سال اس انجمن میں نئے نام جڑتے جاتے ہیں۔

مشاعرہ ہماری اردو تہذیب کی ایک پیاری نشانی:

اردو کے فروغ میں مشاعروں کی اہمیت مسلم الثبوت ہے۔مشاعروں نے اردو کو اور اردو شاعری کو خواص کی محفلوں سے لا کر عوام کے دالان اور گلی کوچوں تک پہنچایا ہے اور اردو زبان سیل جس نے اپنے پروگرام کا نام ہی فروغ اردو رکھا ہے، اس میں انہوں نے ایک سیگمنٹ مشاعرہ کا بھی رکھا ہے۔اس مشاعرے کی خاص بات یہ ہے کہ ہمارے ضلع کے سینئر، باکمال اور کہنہ مشق شعرا کے ساتھ نوجوان اور نوآموز شعرا کو بھی طبع آزمائی کا موقع ملتا ہے یہاں عالمی شہرت یافتہ شعرا سے لے کر ابھرتے ہوئے نوجوان شعرا کو بھی جگہ دی جاتی ہے ۔اس مشاعرے میں سینئر شاعر سلطان شمسی بھی ہوتے ہیں تو اخبار ورسائل میں کثرت سے شائع ہونے والے سرور پنڈولوی اور مقصود عالم رفعت بھی شامل ہوتے ہیں۔ادیب، شاعر اور استاد منور راہی بھی شامل ہوتے ہیں تو احسان مکرم پوری بھی مدعو ہوتے ہیں۔گزشتہ سال اس محفل میں عالمی شہرت یافتہ شاعر انور کمال نے بھی سماں باندھا تھا۔انور کمال صاحب کا کمال یہ ہے کہ ابھی گزشتہ سال انہوں نے اپنے گاؤں برداہا میں "سوردھروہر" کے نام سے کثیر لسانی ادبی تقریب کا انعقاد کیا تھا جس کے مشاعرے میں مصر سے ولا جمال العسیلی، دہلی سے معین شاداب، مہک کیرانوی، ابھیشیک تیواری، راجیو ریاض، دلشاد نجمی وغیرہ جیسے نامور شعرا تشریف لائے تھے۔

اردوزبان سیل کے زیر اہتمام تقریری مسابقہ:

فروغ اردو کے لیے اقدامات میں ہائی اسکول، انٹر اور گریجویشن کے طلبہ وطالبات کے لیے اردو تقریری مسابقہ کا انعقاد بھی ایک اہم کڑی ہے۔ اردو زبان سیل مدھوبنی نے جب سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے طلبہ میں اس مسابقہ میں شرکت کے لیے ہوڑسی لگی ہے۔ طلبہ اس بہانے زبان کی درستگی، الفاظ کی بہتر ادائیگی اور اسٹیج پر خود اعتمادی کی بھی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ شروعات میں اس پروگرام میں شرکت کرنے والوں کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ طلبہ وطالبات کی دلچسپی کم دکھائی دے رہی تھی اور شامل ہونے والے طلبہ کا پرفارمنس بھی متاثر کرنے والا نہ کے برابر ہوتا تھا اور اب کے تقریری مسابقے میں آپ شامل ہوں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ کمپیٹیشن کا لیول ہائی ہو چکا ہے۔ اب طلبہ کے شانہ بہ شانہ طالبات بھی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ یہ بھی اردو کے فروغ کے لیے ایک بہترین پیش رفت ہے۔

اردو زبان سیل اور ضلع اردو نامہ:

اردو زبان سیل کا ایک اہم کارنامہ ضلع اردو نامہ بھی ہے جو پچھلے کئی برسوں سے متواتر شائع ہو رہا ہے۔ یقین جانیے مدھوبنی کی سرزمین سے اس رسالے کی اشاعت اپنے آپ میں ایک حیران کن واقعہ ہے رسالہ بے شک سالنامہ ہے۔ لیکن پابندی سے اس کی اشاعت مدھوبنی ضلع والوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ رسالے کی اشاعت کا آغاز سینیئر اردو مترجم محترم واصف جمال صاحب، اشرف جلیل، حیدر امام صاحب اور دیگر اردو مترجمین کی محنتوں سے ہوا تھا۔ موجودہ ٹرانسلیشن افسر محمد معراج صاحب اور اردو مترجم محمد مہتدیٰ صاحب کی محنت سے یہ رسالہ مسلسل اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ رسالے میں ادبی، علمی، فکری مضامین کے ساتھ نظمیں، غزلیں اور دیگر تخلیقات بھی شامل کی جاتی ہیں۔ یہ رسالہ میری نظر میں ہمارے ضلع کا ایک علمی وادبی دستاویز ہے۔ ہماری سرزمین کی ادبی سرگرمیوں کی تاریخ کا ڈاکیومینٹیشن کر رہا ہے۔ آج سے 30/40 سال بعد جب کوئی اسکالر مدھوبنی ضلع میں اردو زبان وادب کی سرگرمیوں کا حوالہ تلاش کرے گا تو اسے یہ رسالہ رہنمائی کرے گا۔

آج کا میرا مقالہ شاید آپ کو ضلع اردو زبان سیل کے کارناموں تک محدود لگے۔ لیکن یہ مقالہ، صرف مقالہ نہیں بلکہ اعتراف حقیقت ہے۔ کوئی ادارہ کوئی ٹیم متواتر کام کر رہا ہو تو اس کے کام کو سراہنا اس ادارے اور اس ٹیم کے لیے مزید توانائی کا باعث بنتا ہے۔

میں نے ابھی تک اردو زبان سیل یعنی ایک سرکاری ادارے کے اقدامات کی ایک سرسری روداد پیش کی ہے۔ اب آیئے ذرا اپنی اردو آبادی کا محاسبہ کریں۔ اردو آبادی میں غیر سرکاری طور پر اردو کا پروگرام ہمارے ضلع مدھوبنی میں کم ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ضلع میں مذہبی جلسے اور اجتماع زیادہ ہوتے ہیں۔ اول تو اردو کے پروگرام کم ہوتے ہیں اور جو ایک دو پروگرام ہوتے ہیں ان میں عوام کی شمولیت بھی قدرے مایوس کن ہے۔ اردو زبان سیل کے "فروغ اردو" پروگرام کو دیکھ لیجیے۔ ضلع ہیڈ کوارٹر میں منعقد ہونے والے اس پروگرام میں ضلع کے تمام اسکولوں کے اردو اساتذہ کو شرکت کرنے کے لیے باضابطہ مکتوب نکالنا پڑتا تھا۔ اس طرح یہ اردو اساتذہ کا مخصوص پروگرام ہو جاتا تھا، لیکن اب ہر بلاک سے صرف 20 اساتذہ کے لیے مکتوب جاری کیا جاتا ہے اور باقی عام لوگ کی شرکت

کے لیے بھی جگہ رکھی جاتی ہے۔ کیوں کہ ہمارا مقصد اردو کا فروغ ہے۔ تو اردو کا فروغ حقیقی معنوں میں تبھی ہوگا جب اردو کے پروگرام میں عوام وخواص سبھی کی شرکت ہو۔ ہمارے پروگرام میں سماج کے ہر طبقے کی شمولیت ہو سکے ہمیں اس کے لیے بھی کام کرنا ہے۔ اسکول، کالج اور دیگر تعلیمی اداروں کے طلبہ بھی اس پروگرام میں شامل ہوں تو نئی نسلوں کو بھی اپنی زبان اور تہذیب سے جوڑنے کے امکانات روشن ہوں گے۔

خیر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پچھلی ایک دہائی میں اردو کلچر سے تہی دامن ماحول میں اردو سیمینار، ورکشاپ، مشاعرہ اور اردو تقریری مسابقہ کے ذریعے اردو کلچر کے لیے جو ماحول سازی ہوئی وہ قابل تعریف وتحسین ہے ان شاءاللہ آنے والے دنوں میں مزید اقدامات کے ذریعے اردو زبان کے فروغ کے کے نئے دروازے بھی کھلیں گے۔ فروغ اردو کے امکانات کے تحت بہار میں ان دنوں ایک امید افزا واقعہ یہ ہوا ہے کہ حکومت بہار نے ہمارے اسکولوں میں خاصی تعداد میں دیگر مضامین کے ساتھ اردو اساتذہ کی بھی تقرری کی ہے۔ یہاں میں اردو اساتذہ کی تقرری کا اعداد وشمار پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حکومت بہار نے 2023 سے اب تک بی پی ایس سی کے ذریعے بہار کے اسکولوں میں دو لاکھ سے زائد اساتذہ کی تقرری کی ہے جس میں ٹی آر ای 1 میں پرائمری سطح پر 7797، ہائی اسکول سطح پر 1612 اور پلس ٹو اسکولوں میں 145 اردو اساتذہ کی تقرری ہوئی؛ ایسے ہی ٹی آر ای 2 میں 1320 پرائمری، 1551 مڈل اسکول، 1222 ہائی اسکول اور 1636 پلس ٹو لیول کے اردو اساتذہ کی بحالی ہوئی ہے۔ ٹی آر ای 3 میں پرائمری سطح پر 3054، مڈل اسکول 1027، ہائی اسکول 807 اور پلس ٹو میں 586 اردو اساتذہ کی تقرری ہوئی ہے۔ ان سب کو جوڑا جائے تو 20757 اردو اساتذہ کی بحالی بی پی ایس سی کے تین امتحانات کے ذریعے فقط ڈھائی سال میں ہوئی ہے۔ ایسے ہی حالیہ برسوں میں بہار کے بلاک، سب ڈویژن ضلع کلکٹریٹ کے علاوہ دیگر محکموں کے لیے تقریباً 142 اردو مترجمین اور 1294 سیٹوں پر معاون اردو مترجمین کی بھی بحالی ہوئی ہے۔ پتہ یہ چلا کہ اردو پڑھنے والوں کو بہار میں سرکاری ملازمت میں بھی اچھے مواقع ہیں۔ اس طرح اردو زبان کے فروغ کے امکانات روشن ہیں۔ بس ہمیں مزید محنت کی ضرورت ہے۔ نئی نسلوں کی تربیت اور ذہن سازی کی ضرورت ہے۔ انہیں یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ اردو پڑھ کر بھی آپ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

حاشیائی ادب اور خواجہ احمد عباس

محمد مناظر حسین
پی ایچ ڈی اسکالر دہلی یونیورسٹی
فون نمبر:9142318247

حاشیائی ادب ایک ایسی ادبی تحریک ہے جو ہندوستانی سماج کے نچلے طبقات خاص طور پر پسماندہ طبقات کے تجربات جدوجہد اور مظالم کو بیان کرتی ہے۔ یہ ادب سماجی انصاف مساوات اور ذات پات کے نظام کے خلاف ایک احتجاج کے طور پر ابھرا ہے۔

حاشیائی ادب کی تعریف:

حاشیائی ادب ان تخلیقات پر مشتمل ہے جو ذات پات کے نظام کے تحت ہونے والی سماجی تفریق استحصال اور ناانصافی کو نمایاں کرتی ہیں۔ یہ ادب پسماندہ طبقات کی روزمرہ زندگی ان کے خوابوں جدوجہد اور سماجی و اقتصادی چیلنجز کی عکاسی کرتا ہے۔

حاشیائی ادب کے مقاصد:

حاشیائی ادب کے مقاصد ذات پات کے نظام اور سماجی اقتصادی اور ثقافتی استحصال کے خلاف ایک مزاحمتی تحریک کی بنیاد پر قائم ہیں۔ یہ ادب سماجی انصاف مساوات اور انسانیت کے اصولوں پر مبنی ایک بہتر معاشرے کی تشکیل کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔
اس کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں:

ا۔ ذات پات کے نظام کے خلاف احتجاج:

حاشیائی ادب کا سب سے بڑا مقصد ذات پات کے غیر منصفانہ اور جابرانہ نظام کے خلاف آواز اٹھانا ہے۔ یہ ادب اس نظام کی ان برائیوں کو بے نقاب کرتا ہے جو صدیوں سے سماج کو تقسیم اور مظلوم طبقات کو کمزور کرتی آئی ہیں۔
مصنفین ذات پات پر مبنی ظلم ذلت اور تفریق کی حقیقتوں کو بے خوفی سے بیان کرتے ہیں۔ وہ اس نظام کے خاتمے کے لیے اجتماعی شعور کو بیدار کرتے ہیں۔

۲۔ پسماندہ طبقات کے تجربات کا اظہار:

حاشیائی ادب ان کہانیوں مسائل اور تجربات کو سامنے لاتا ہے جو پسماندہ طبقات کے افراد نے اپنی زندگی میں جھیلے ہیں۔
یہ ادب ان کے درد محرومیوں اور جدوجہد کو لفظوں کے ذریعے بیان کرتا ہے۔اس میں ذاتی تجربات جذبات اور حقیقت پر مبنی کہانیوں کو بیان کیا جاتا ہے تاکہ سماج ان کے حالات کو بہتر طور پر سمجھ سکے۔

۳۔سماجی شعور پیدا کرنا:

حاشیائی ادب کا ایک اہم مقصد سماجی شعور پیدا کرنا ہے تاکہ لوگ ذات پات کے نظام کی برائیوں کو سمجھیں اور اس کے خلاف جدوجہد کریں۔یہ ادب معاشرے کو مساوات بھائی چارے اور انسانی وقار کے اصولوں پر مبنی ایک نظام اپنانے کی ترغیب دیتا ہے۔
حاشیائی ادب غیر پسماندہ افراد کو بھی مخاطب کرتا ہے تاکہ وہ پسماندہ طبقات کے مسائل کو سمجھ سکیں اور ان کے ساتھ کھڑے ہوں۔

۴۔پسماندہ طبقات کی خوداعتمادی بحال کرنا:

ذات پات کے نظام نے پسماندہ افراد کو صدیوں تک ان کے انسانی حقوق سے محروم رکھا اور ان کی خوداعتمادی کو نقصان پہنچایا۔
حاشیائی ادب کا مقصد ان میں اعتماد پیدا کرتا ہے۔یہ ادب ان کو یقین دلاتا ہے کہ وہ مساوی حقوق کے مستحق ہیں اور اپنی جدوجہد کے ذریعے اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔

۵۔تاریخی اور ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنا:

پسماندہ طبقات کا ایک وسیع اور منفرد تاریخی اور ثقافتی ورثہ ہے جسے صدیوں سے نظر انداز کیا گیا ہے۔حاشیائی ادب اس ورثے کو محفوظ کرنے اور اسے دنیا کے سامنے لانے کا کام کرتا ہے۔ان کی روایات ثقافت اور جدوجہد کو تحریری شکل میں محفوظ کیا جاتا ہے۔

۶۔سماجی اور سیاسی تبدیلی کی تحریک:

حاشیائی ادب کا ایک بڑا مقصد سماج میں مثبت تبدیلی لانا ہے۔یہ ادب پسماندہ طبقات کے لیے مساوی حقوق تعلیم روزگار اور عزت کے مواقع کے لیے تحریک پیدا کرتا ہے۔یہ ایک مضبوط سماجی اور سیاسی پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے جو قانون سازی اور پالیسی سازی پر اثر ڈال سکے۔

۷۔انسانیت اور مساوات کا فروغ:

حاشیائی ادب کا ایک وسیع مقصد انسانی مساوات اور وقار کا فروغ ہے۔یہ ادب کسی خاص مذہب یا ذات سے بالاتر ہو کر انسانی اقدار کی بات کرتا ہے۔یہ ادب ایک ایسے سماج کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے جہاں ہر فرد کو برابری اور انصاف ملے۔

حاشیائی ادب کی خصوصیات:

۱۔ذاتی اور اجتماعی تجربات:

یہ ادب ذاتی اور اجتماعی مظالم غربت اور تفریق کی داستانوں پر مبنی ہوتا ہے۔

۲۔سادہ زبان:

حاشیائی ادب کی زبان عام طور پر سادہ اور براہ راست ہوتی ہے تاکہ ہر طبقہ اسے سمجھ سکے۔

۳۔احتجاجی لہجہ:

یہ ادب اکثر احتجاجی اور انقلابی انداز اختیار کرتا ہے تاکہ سماجی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی جاسکے۔

۴۔حقیقی مسائل کی عکاسی:

حاشیائی ادب معاشرتی حقیقتوں اور مسائل کو کھلے الفاظ میں بیان کرتا ہے جیسے چھوا چھوت غربت اور جبر۔

حاشیائی ادب کی ابتداء اور تاریخ:

حاشیائی ادب کی بنیاد ہندوستان میں ذات پات کے نظام کے خلاف ہونے والی جدوجہد سے پڑی خاص طور پر ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی تحریکوں سے۔

مراٹھی ادب:

حاشیائی ادب کی باقاعدہ ابتدا مراٹھی زبان میں ہوئی جہاں 1960 کی دہائی میں پسماندہ شعرا اور ادبا نے اپنی تخلیقات کے ذریعے احتجاج کیا۔ یہ ادب ہندی تمل گجراتی بنگالی اور دیگر زبانوں میں بھی پروان چڑھا۔

اردو میں حاشیائی ادب:

اردو میں حاشیائی ادب ابھی اپنے ابتدائی مراحل میں ہے لیکن اردو شاعری اور نثر دونوں میں ''حاشیائی ادب'' کے بجائے ''ذات پات'' اور ''سماجی تفریق'' جیسے موضوعات پر بے شمار تخلیقات ملتی ہیں۔ منشی پریم چند کے افسانے 'کفن' اور 'ٹھاکر کا کنواں' حاشیائی ادب کے زمرے میں شمار کیے جاسکتے ہیں کیونکہ وہ ذات پات اور طبقاتی تفریق کو موضوع بناتے ہیں۔ اردو ادب میں پسماندہ تحریک کی جھلکیاں ترقی پسند تحریک کے ادب میں بھی نظر آتی ہیں جہاں سماجی ناانصافی طبقاتی تفریق غربت اور انسانی مساوات کے موضوعات پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

حاشیائی ادب کی اہمیت:

حاشیائی ادب مظلوموں کی آواز ہے۔ یہ سماج میں چھپی ہوئی ناانصافیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہ ادب نہ صرف پسماندہ طبقات کے مسائل کو اجاگر کرتا ہے بلکہ سماجی تبدیلی کا ایک طاقتور ذریعہ ہے جو برابری اور انصاف کی راہ ہموار کرتا ہے۔

اردو میں جن تخلیق کاروں کے یہاں حاشیائی ادب پایا جاتا ہے ان میں ایک نام خواجہ احمد عباس کا ہے خواجہ احمد عباس اردو ادب کے ایک بلند پایہ افسانہ نگار ناول نگار صحافی اور فلم ساز تھے۔ ان کی ادبی خدمات اور افسانوی طرز تحریر نے اردو ادب میں گہرا اثر چھوڑا ہے۔ وہ سماجی حقیقت نگاری انسان دوستی اور اصلاحی فکر کے حوالے سے مشہور ہیں۔ ان کے افسانے سماجی مسائل طبقاتی

تفریق اور انسانی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''ٹیری لین کی پتلون'' حاشیائی ادب پر لکھے گئے اردو کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانہ میں ہندوستانی معاشرے میں پھیلے چھوا چھوت ذات پات اور سماجی وطبقاتی تفریق کو بڑے اچھے انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔

افسانے کا آغاز منگو کے بچپن سے ہوتا ہے جو ایک نچلی ذات سے تعلق رکھنے والا لڑکا ہے وہ بچپن سے ذات پات کے ظالمانہ برتاؤ کا شکار ہے؛ اسکول میں اسے برآمدے میں ایک گندی پھٹی ہوئی چٹائی پر بٹھایا جاتا ہے جبکہ دیگر بچے بینچوں اور میزوں پر بیٹھتے ہیں یہ تفریق معصوم منگو کے ذہن میں سوالات پیدا کرتی ہے۔ ایک دن جب وہ وقت سے پہلے اسکول پہنچتا ہے تو بینچ پر بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن چپراسی رام دین اسے سختی سے منع کر دیتا ہے اور اسے ''اچھوت'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے منگو کو اس لفظ کا مطلب تو سمجھ نہیں آتا مگر وہ اپنے آپ کو کمتر اور ناقابل قبول محسوس کرنے لگتا ہے۔

جب منگو مڈل اسکول پاس کر لیتا ہے تو وہ اپنے ہم ذات دوست رلدو کے ساتھ بمبئی چلا جاتا ہے جہاں اسے ایک صابن بنانے والی کمپنی میں چپراسی کی نوکری ملتی ہے۔ بمبئی میں منگو اپنی اصل ذات چھپا کر خود کو ''منگت سنگھ'' اور ذات کے لحاظ سے ''راجپوت'' ظاہر کرتا ہے۔ نئی شناخت کے ساتھ وہ ذات پات کے بوجھ سے آزاد محسوس کرتا ہے اور اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

منگو ایک دن کپڑوں کے شوروم کے باہر ایک ڈمی کو دیکھتا ہے جسے ٹیری لین کی پتلون پہنائی گئی ہے؛ وہ پتلون منگو کو بے حد پسند آتی ہے لیکن اس کی قیمت اسّی روپے ہے جو منگو کی پوری ماہانہ تنخواہ کے برابر ہے پھر بھی وہ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے پیسے بچانا شروع کر دیتا ہے۔

منگو کو اپنے دفتر کی ایک اسٹینو گرافر مس کملا راٹھور پسند آجاتی ہے جو ایک راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ منگو اس میں دلچسپی لینے لگتا ہے کملا بھی منگو کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ ایک دن کملا اسے اپنے گھر بلاتی ہے تاکہ اپنے والد سے رشتے کی بات کر سکے۔ منگو جو اس وقت تک ٹیری لین کی پتلون خرید چکا ہے سوٹ بوٹ پہن کر کملا کے گھر پہنچتا ہے۔ اسّی روپے کی پتلون نے آج اسے سچ میں منگت سنگھ بنا دیا تھا۔ اس کی شخصیت کملا کے باپ کو بے حد متاثر کرتی ہے کملا کا باپ یہ سن کر اور بھی خوش ہوتا کہ لڑکا اپنی ہی برادری کا ہے کیونکہ منگو خود کو راجپوت بتاتا ہے لیکن جب انہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ منگو دفتر میں ایک چپراسی ہے اور اس کی تنخواہ محض اسّی روپے ہے تو وہ اس رشتے سے انکار کر دیتا ہے۔ یہاں منگو جو پہلے سماجی تفریق کا سامنا کر رہا تھا اب طبقاتی تفریق کا شکار ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات:

حاشیائی کرداروں کی عکاسی مرتب ڈاکٹر شاہد الرحمن

کلیات خواجہ احمد عباس جلد دوم مرتب ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

احسان مکرم پوری
سکریٹری انجمن فروغ اردو مکرم پور

غزل

سینے میں محبت بھرے ارمان جگا کے
دل ڈال دیا قدموں پہ اک شوخ ادا کے

یہ کیا کہ خبر ہی نہ لی پردیس میں جا کے
کچھ پرسش حالات تو کرتے کبھی آ کے

ہم سا کوئی نا کام محبت بھی نہ ہوگا
ہم کو تو جفا ہی ملی بدلے میں وفا کے

افلاس زدہ چہرے پہ اور رنگ بشاشت؟
شرمندہ نہ کر مجھ کو تو آئینہ دکھا کے

جھلسا نہیں سکتی مجھے یہ جلتی ہوئی دھوپ
سائے ہیں مرے ساتھ مری ماں کی دعا کے

تعبیر ہی جب درد کے ماروں سے خفا تھی
کرتے بھی کیا آنکھوں میں نئے خواب سجا کے

افسوس یہ ہے مل گئی جب خاک میں ہستی
تب پھول گلستاں میں کھلے مہر و وفا کے

اک طائر نو پر ہوں خیال اتنا تو کیجے
جھونکے نہیں سہ پاؤں گا میں تند ہوا کے

اس زلف سیاہ فام کا اعزاز ہے احسانؔ
نیند آ گئی سائے میں مجھے کالی گھٹا کے

ڈاکٹر منور عالم راہی

غزل

میری آنکھوں کی تمنا ہے وہاں تک دیکھوں
تو ہی تو مجھ کو نظر آئے جہاں تک دیکھوں

پھر سے ناساز طبیعت ہو مقدر سے مری
سر پہ ماں ہاتھ رکھے باغ جناں تک دیکھوں

اس کے ہی عکس مناظر میں ہیں کہہ دوں کیسے
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

کس نے پہنچا دیا اس حال تک سوچا ہے کبھی
ملک کا لٹتا ہوا امن و اماں تک دیکھوں

یا الٰہی مری تقدیر میں لکھا کیا ہے
میں تباہی کے نشاں اور کہاں تک دیکھوں

عقل کہتی ہے سنبھل مشورہ دیتا ہے جنوں
راہ کافر کی موذن کی اذاں تک دیکھوں

میں پریشاں ہوں یہاں بسر سکوں اے راہیؔ
آؤ چل کر کسی مفلس کے مکاں تک دیکھوں

غزل

محمد مجتبیٰ راحل قاسمی

ایک لمحے میں کئی عہد ٹھہر جاتا ہے
اور کبھی وقت دبے پاؤں گذر جاتا ہے

خوفِ رہزن ہے سفر میں تو کوئی بات نہیں
عزم ہو زادِ سفر کٹ بھی سفر جاتا ہے

وہ گئی دھوپ کہ خوشبو سے پسینہ مہکا
چاہ کی آنکھ میں کاجل بھی بکھر جاتا ہے

رقصِ وحشت کا سفر دیر نہیں دور تلک
جبر کے پاؤں سے گھنگھرو بھی اتر جاتا ہے

وقت و حالات نے گلشن سے نکالا ہم کو
خود سے ہو کے نہ کوئی شہر بدر جاتا ہے

ہر گھڑی ایک ہی دھن ایک تصور کا سرور
دل کے آئینے میں جب کوئی سنور جاتا ہے

کتنی بدلی ہے یہ تصویر بدلتی دنیا
وقت وہ آیا ہے کشتی میں بھنور جاتا ہے

شعر کہتے ہوئے ہو جاتا ہے پتّا پانی
رائگاں خونِ تمنا کا اثر جاتا ہے

سرد مہری کا چلن عام ہے اتنا کہ یہاں
بے ثمر یوں ہی مِرا کارِ ہنر جاتا ہے

کرتے راحلؔ جو جگر کاوی سخنور ہوتے
زر نہیں اِس میں کوئی اور نہ گھر جاتا ہے

شائق یکہتوی

غزل

یہ شہرِ بے چراغ ہے ہو کس گمان میں؟
سورج کو ساتھ لائے ہو رکھ دو مکان میں

اب دیکھنا ہے اس کی پہنچ ہے کہاں تلک
ہر آن ہے عقابِ تخیّل اڑان میں

موسم کے سرد گرم کا اتنا اثر نہ تھا
راحت نصیب تھی ہمیں کچے مکان میں

دشمن سروں پہ آ کے کھڑا کب سے ہے و لے
رکھی ہے اپنی تیغ ابھی تک مِیان میں!

بولے گا کون تیری حمایت میں یارِ من!
تالے پڑے ہیں سب کی یہاں پر زبان میں

ہم سیکھتے ہیں ان سے بھی کچھ طرزِ زندگی
رکھے خدا عدو کو بھی اپنی امان میں

غزل

زویا احترام تمنّا
سنگرام مدھوبنی

مرے خوابوں میں آنا جانتا ہے
محبت وہ جتانا جانتا ہے
جدائی کو مقدر کر کے میرا
وہ یادوں میں جلانا جانتا ہے
محبت کو مری قسمت بنا کر
وہ راتوں کو جگانا جانتا ہے
نگاہیں رخ پہ میری جم گئی ہیں
مجھے یونہی سجانا جانتا ہے
لبوں پر نام میرا ہی سجا کر
مجھے وہ گنگنانا جانتا ہے
زمانے میں مری عزت کی خاطر
مرے خط وہ چھپانا جانتا ہے
ادا اپنی چلا کر عشق کی وہ
تمنّا کو مٹانا جانتا ہے

بھارتی رنجن کماری

غزل

محبت کے حسیں گلشن میں بن کے پھول کھل جاتی
ترے قدموں تری گلیوں میں بن کے دھول اڑ جاتی

میں دیکھتی جب آئینہ تیرا عکس بن جاتی
تیری چاہت میری حسرت کوئی الفت بن جاتی

اصول عشق میں جاناں جدائی غم کیا ہوتی ہے
تیری یادوں کے صبحوں میں شبنم بھی روتی ہے

پہلے ہی کاش دل کو میں سمجھا پاتی
وفا نہ مل سکے گی ارماں جو رہے باقی

وفاؤں کا میرا ہمدم یہ صلہ ایسا ہے
نہ جی پاؤں نہ مر پاؤں یہ فیصلہ کیسا ہے؟

خوابوں کے دیواروں پر نام لکھ کے ہوں مٹاتی
دیکھوں تیرا میں راستہ حال تم سے کاش کہہ پاتی

ظفر امام حبیبی

چمپارن

غزل

میرے غم کا راز داں کوئی نہیں
ہائے مجھ سا بے اماں کوئی نہیں

ہے نہ کوئی یار کوئی غم گسار
محرم درد نہاں کوئی نہیں

بے سروسامانیاں دولت مری
دھوپ سر پر سائباں کوئی نہیں

دور دائم صحن گلشن سے رہا
شاخ گل یا آشیاں کوئی نہیں

ہوں اسیر بے کسی و بے بسی
پھر بھی لب پہ ہے فغاں کوئی نہیں

جبرِ پیہم، ماجرائے زندگی
میرے جیسا بے زباں کوئی نہیں

رب کی رحمت ساتھ ہے تیرے ظفرؔ
غم نہیں گر مہرباں کوئی نہیں

مقصود عالم رفعت

غزل

کیا خوب پروئے گئے افکار غزل میں
آتا ہے نظر چہرۂ فن کار غزل میں

ہرگز نہیں لکھے کبھی امراء کے قصیدے
کرتے ہیں قلندر کے ہم اذکار غزل میں

بھیجا ہے غزل میں تجھے پیغامِ محبت
لکھ بھیجنا انکار یا اقرار غزل میں

ایسا نہیں کہ ذکرِ زلیخا ہی فقط ہو
یوسف کا رقم ہو کبھی کردار غزل میں

تم سامنے بیٹھے رہو کہنے دو مجھے شعر
رکھنا ہے ترے چہرے کے انوار غزل میں

تذلیل کا خطرہ ہے نہ بدنامی کا کچھ خوف
چاہو تو کرو عشق کا اظہار غزل میں

مخفی نہیں اس میں ہیں فقط ذوق کے ساماں
ملتے ہیں تصوف کے بھی اسرار غزل میں

کیا زلف غزل خوب سنواری گئی تم سے
آتا ہے نظر حسن کا معیار غزل میں

تب جا کے میں رفعتؔ تجھے مانوں گا سخنور
آنے جو لگیں میر سے اشعار غزل میں

سرور پنڈولوی
روز اسٹڈی سرکل اسٹیشن روڈ
پنڈول مدھوبنی

غزل

دِل تو دیوانہ ہے یہ کیسے محبّت مانگے
کام دوزخ کے کرے اور ہے جنّت مانگے

سامنے تیرے سبھی پُھول ہی پژمردہ ہیں
سارا گلزار فقط تیری شباہت مانگے

کوئی فانوس دیے کو مرے کب بھاتا ہے
حوصلہ دیکھو ہواؤں کی یہ صحبت مانگے

عیب جوئی بھی کروں اور دوں سب کو گالی
مجھ سے کیا کیا نہ بُرائی مری شہرت مانگے

ایک دو چیز نہیں چاہتی یہ حرّافہ
مجھ سے شہوت مری عزت مری دولت مانگے

چاہتا ہوں رہے ایماں تو سلامت میرا
مجھ سے کچھ اور ہی دُنیا کی تجارت مانگے

نام سؔرور ہے فقط کام بھی کچھ ہیں تیرے
پھر قبیلے کی بھلا کیوں تُو قیادت مانگے

ارشد کمالی بالاساتھوی
ودیاپتی ہائی اسکول بسفی

غزل

مت کسی کو راہ چلتے بے سبب رسوا کرو
اہل دنیا کو نگاہ پیار سے دیکھا کرو

چل رہا ہے برق رفتاری سے یوں تو یہ جہاں
اس زمانے میں نیا کچھ اور بھی سوچا کرو

روشنی پھیلے جہاں میں چاروں جانب علم سے
جہل کی تاریکیاں چھٹ جائیں کچھ ایسا کرو

دشمنی جتنی کرو تم اپنے بھائی سے مگر
قتل کرنے کے لئے ان کا نہ تم دعوی کرو

جس سے کچھ پھولے پھلے ہمسایہ اپنا بھی سدا
تم پڑوسی کے لیے ایسا بھی کچھ سوچا کرو

نسل نو بھی معترف ہو شاعری کی جا بجا
اس لئے اے ہمدمو پیدا نیا لہجہ کرو

فکر میں ندرت ہو ارشدؔ اور لہجہ بھی حسیں
شاعرانہ خوبیوں سے سب کو تم شیدا کرو

محمد مہتدیٰ ندوی
کلکٹریٹ، مدھوبنی

فروغِ اردو کے تعلق سے ضلع اردو زبان سیل کی سرگرمیاں

اردو ہندوستان اور دنیا بھر میں بولی جانے والی زبانوں میں ایک اہم اور سرفہرست زبان ہے، اس کی تاریخ شاندار اور پر شکوہ رہی ہے، ہندوستان میں پیدا ہوئی پھر پوری دنیا میں پھیلی اور پھلی پھولی۔ اردو بہار میں دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے نافذ العمل ہے جس کے فروغ کے لئے حکومت بہار سنجیدہ اور کوشاں بھی ہے، فروغ اردو کے تعلق سے حکومت بہار تمام اضلاع میں مختلف طرح کی ادبی بزم سجاتی ہے، مدھوبنی ضلع میں منعقدہ پروگرام کی تفصیل پیشِ خدمت ہے۔

تقریری مسابقتی پروگرام:

اردو ڈائریکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومت بہار کے زیرِ ہدایت ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی کی جانب سے اردو داں طلبہ وطالبات کے مابین حوصلہ افزائی تقریری مسابقتی پروگرام واٹسن ہائی اسکول مدھوبنی کے ہال میں ۳۱ مئی ۲۰۲۵ کو بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منعقد ہوا، پروگرام میں ضلع بھر کے طلبہ وطالبات نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ حصہ لیا اور خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی اپنی تقریریں پیش کیں۔

پروگرام میٹرک، انٹر اور گریجویشن کے طلبہ وطالبات پر مشتمل تھا، سبھی زمرے کے طلبہ وطالبات کے لئے الگ الگ عناوین طے گئے تھے جس کے تحت طلبہ وطالبات نے پروگرام میں حصہ لیا، عناوین کے انتخاب میں جہاں اردو زبان کو شامل کیا گیا تھا وہیں موجودہ زمانے کے سلگتے مسائل جیسے سڑک حادثات کے نقصانات اور اس سے بچاؤ کی تدابیر، شجرکاری کی اہمیت اور ماحولیاتی آلودگی کے برے نتائج اور اس سے بچاؤ کی ترکیب جیسے معاصر عناوین پر بھی طلبہ وطالبات کی تیاری کروا کے ان کے اندر بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یوں تو سبھی طلبہ وطالبات نے بھرپور تیاری کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کو ادا کیا اور سبھی کی کارکردگی شاندار تھی لیکن ہر زمرے سے آٹھ آٹھ بچے ہی پوزیشن کے حقدار ہوئے، انعام یافتہ طلبہ وطالبات کو رقم اور میڈل سے نوازا گیا؛ بچوں کی کارکردگی کی بنیاد پر حکم حضرات نے ان کی پوزیشن طے کی۔ حکم کے فرائض پروفیسر مرغوب عالم، پروفیسر عبدالغنی، ڈاکٹر مناظر حسین، ڈاکٹر علی اختر اور محترمہ بشریٰ رحمن شیخ نے ادا کئے۔

فروغِ اردو سیمینار، مشاعرہ و اردو عمل گاہ (تربیتی ورکشاپ):

اردو زبان سیل مدھوبنی کی جانب سے منعقد ہونے والے پروگراموں میں فروغ اردو سیمینار، مشاعرہ و اردو عمل گاہ بھی اپنی نوعیت کا منفرد اور متنوع پروگرام ہے جس میں فروغ اردو کے تعلق سے مقالہ نگار حضرات اپنے قیمتی مقالات پیش کرتے ہیں، شعراء حضرات محفل مشاعرہ میں اپنا شعری جوہر دکھاتے ہیں اور اردو زبان کے اساتذہ و اردو ملازمین ایک ساتھ سر جوڑ کر فروغ اردو کے تعلق سے راہ عمل طے کرتے ہیں۔ فروغ اردو سیمینار، مشاعرہ و اردو عمل گاہ کا انعقاد مورخہ ۱۲ جولائی ۲۰۲۵ کو ٹاؤن ہال مدھوبنی میں منعقد ہوا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جناب آنند شرما نے پروگرام کا افتتاح کیا اور اپنے خطاب میں اردو زبان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے سامعین سے اردو زبان سیکھنے سکھانے پر زور دیا۔

پروگرام کی پہلی نشست فروغ اردو سیمینار سے متعلق تھی جس میں ڈاکٹر صدر عالم گوہر، جناب نجم الہدیٰ ثانی، ڈاکٹر عمر فاروق، ڈاکٹر محمد حسین اور ڈاکٹر تجمل حسین نے فروغ اردو کے سلسلے میں اپنے اپنے بیش بہا مقالات پیش کئے۔ نشست ثانی میں مشاعرہ کا انعقاد ہوا، مشاعرہ کی صدارت مدھوبنی ضلع کے قدآور اور بزرگ شاعر جناب سلطان شمسی کے حصے میں آئی؛ مشاعرہ بہت کامیاب رہا، شروع سے اخیر تک سامعین ڈٹے رہے، تمام شعراء کے کلام کو بغور سنتے رہے اور معیار کلام کے مطابق داد وتحسین سے بھی شعراء کو نوازتے رہے۔

مشاعرہ میں علاقائی اور بہار کے نامور شعراء نے شرکت کی: سلطان شمسی، ڈاکٹر منور راہی، احسان مکرم پوری، ظفر امام حبیبی، سرور پنڈولوی، حسیب الرحمن شائق، اسامہ عاقل، زویا احترام تمنا اور محترمہ بھارتی رنجن کماری نے اپنے اپنے کلام سے مشاعرہ میں سماں باندھ دیا اور مشاعرہ کو بے حد کامیاب بنایا، اس مشاعرہ کی نمایاں خصوصیت یہ رہی کہ مشاعرے میں دو دو خاتون شاعرہ محترمہ زویا احترام تمنا اور محترمہ بھارتی رنجن کماری اپنی شاندار شاعری سے مشاعرہ کی کامیابی کی ضمانت بنیں۔ مجموعی طور پر پروگرام نہایت کامیاب اور معیاری رہا، اس طرح سے اردو کے لئے سجائی گئی بزم بحسن تمام اختتام پذیر ہوئی۔

ضلع اردو نامہ کی اشاعت:

ضلع اردو زبان سیل کی جانب سے فروغ اردو کی ایک اہم کڑی "ضلع اردو نامہ" کی اشاعت ہے، ضلع اردو نامہ میں علاقائی شعراء، مضمون نگار اور نوقلم کاروں کی تحریروں کو شامل کر کے انہیں اپنی تحریری صلاحیت نکھارنے کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ وہ مستقبل کے ماہر لکھاری، قلمکار اور مضمون نگار بن سکیں اور اپنی تحریر سے فروغ اردو کی شمعیں جلا سکیں؛ ہر سال کی طرح اس سال بھی ضلع اردو نامہ کی اشاعت کی جا رہی ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس طرح سے تقریر وتحریر ہر دو جانب سے فروغ اردو کے لئے ضلع اردو زبان سیل کی جانب سے خوش اسلوبی کے ساتھ مذکورہ بالا پروگرام منعقد کئے جاتے ہیں اور امید ہے کہ آگے بھی منعقد ہوتے رہیں گے۔

مدھوبنی ضلع کے اردو اہلکار

نمبر شمار	اسمائے ملازمین	عہدے	موبائل نمبرات
۱	معراج احمد	انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی	9431516382
۲	واصف جمال	سینئر اردو مترجم سب ڈویژن جے نگر مدھوبنی	7281007076
۳	محمد مہتدیٰ ندوی	اردو مترجم ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی	7979922988
۴	محمد ذاکر حسین	اردو مترجم ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی	8271765570
۵	سید امیر معاویہ قاسمی	معاون اردو مترجم ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی	8298968222
۶	راجو کمار	زیریں درجہ محرر ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی	8083475026
۷	بشریٰ حبیب	اردو مترجم صدر سب ڈویژن دفتر مدھوبنی	8294748878
۸	جاوید یوسف	بالا درجہ محرر صدر سب ڈویژن دفتر مدھوبنی	7050787502
۹	محمد مظہر امام	اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر رہیکا مدھوبنی	8083316015
۱۰	محمد تنویر عالم	اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر بسفی مدھوبنی	9576599554
۱۱	محمد غضنفر علی	بالا درجہ محرر بلاک ترقیاتی دفتر کھجولی مدھوبنی	9709549776
۱۲	محمد ارشاد عالم	بالا درجہ محرر بلاک ترقیاتی دفتر پنڈول مدھوبنی	9905010524
۱۳	محمد نواز	بالا درجہ محرر بلاک ترقیاتی دفتر پھلپراس مدھوبنی	9939680845
۱۴	محمد اختر پرویز	بالا درجہ محرر سب ڈویژن دفتر بینی پٹی مدھوبنی	7903994643
۱۵	محمد اقبال انجم	معاون اردو مترجم سب ڈویژن دفتر بینی پٹی مدھوبنی	7320013790
۱۶	انجم رضا راہی	معاون اردو مترجم سب ڈویژن دفتر جے نگر مدھوبنی	7983412039
۱۷	محمد نعیم اللہ	معاون اردو مترجم صدر سب ڈویژن دفتر مدھوبنی	9669302886

۱۸	اعجاز احمد	معاون اردو مترجم سب ڈویژن دفتر پھلپراس مدھوبنی	9110033770
۱۹	محمد موسیٰ	معاون اردو مترجم سب ڈویژن دفتر جھنجھار پور مدھوبنی	7739576778
۲۰	احسن رضا	معاون اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر بابوبرہی مدھوبنی	8877879754
۲۱	راضیہ فرحین	معاون اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر رہیکا مدھوبنی	7549477101
۲۲	محمد واجد حسین	معاون اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر جھنجھار پور مدھوبنی	9801682173
۲۳	محمد محسن	معاون اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر بسفی مدھوبنی	8789714243
۲۴	سلمان احمد	معاون اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر مدھے پور مدھوبنی	9006567818
۲۵	محمد مرتضیٰ اعظمی	معاون اردو مترجم سرکل آفس جھنجھار پور مدھوبنی	8084061786
۲۶	محمد شہنشاہ	معاون اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر جے نگر مدھوبنی	9472200971
۲۷	محمد شباب	معاون اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر گھوگھرڈیہا مدھوبنی	6202437647
۲۸	محمد ریحان عالم	معاون اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر پھلپراس مدھوبنی	7970715081
۲۹	وحدت جہاں	معاون اردو مترجم سرکل آفس رہیکا مدھوبنی	9027838855
۳۰	ثمامہ ارم	معاون اردو مترجم بلاک ترقیاتی دفتر پنڈول مدھوبنی	8294193707
۳۱	محمد سیف الدین انصاری	معاون اردو مترجم سرکل آفس پھلپراس مدھوبنی	7739874438
۳۲	روی پرکاش چودھری	معاون اردو مترجم سرکل آفس کھٹونا مدھوبنی	9122159301

ضلع مجسٹریٹ جناب آنند شرما و دیگر افسران فروغ اردو سیمینار، مشاعرہ و اردو عمل گاہ کا شمع افروزی کر کے افتتاح کرتے ہوئے۔

جناب معراج احمد انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل مدھوبنی، ضلع مجسٹریٹ کا گلدستہ پیش کر استقبال کرتے ہوئے

فروغ اردو سیمینار میں شریک مقالہ نگار، شعراء اور مہمانان خصوصی

فروغ اردو سیمینار میں شریک اردو اساتذہ، علمی و ادبی شخصیات اور عوام

مقررہ طالبہ اسنیہا کماری انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل کے ہاتھوں سند توصیفی حاصل کرتی ہوئی

شاعر جناب ظفر امام حبیبی انچارج افسر ضلع اردو زبان سیل کے ہاتھوں سند توصیفی حاصل کرتے ہوئے

انچارج افسر کے ساتھ مدھوبنی ضلع میں تعینات اردو ملازمین

انچارج افسر و دیگر مہمانوں کے ہاتھوں ڈاکٹر محمد رضوان کی کتاب "کلیم عاجز کی شاعری: تنقید و تجزیہ" کا رسم اجراء

محمد مہتدیٰ ندوی اردو مترجم (کلکٹریٹ مدھوبنی) پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے

امیر معاویہ قاسمی معاون اردو مترجم (کلکٹریٹ مدھوبنی) پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے

محترمہ بھارتی رنجن کماری پروگرام میں اپنا شعری کلام پیش کرتی ہوئیں

مدھوبنی میں واقع تاریخی عمارت

نولکھا راج محل